Registered No. L. 4186

ربیع الآخر ۱۳۶۱ھ — جلد ۲۰ ۔ عدد ۴

۴۲ء

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک ۔ پونچھ روڈ ۔ لاہور

قیمت سالانہ ۵ر — قیمت فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

ربیع الآخر سنہ ۶۱ھ (جون سنہ ۴۲ء) جلد ۲۰ عدد ۴

باہتمام سید ابو الاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک

پریس سرکلر روڈ میں طبع ہو کر دفتر

"ترجمان القرآن"، مبارک پارک لاہور

سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

اپنے نئے مرکز میں آئے ہوئے ہمیں ایک مہینہ ہو چکا ہے۔ اس دوران میں یہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد کام کا جو نقشہ بنایا گیا ہے اس کو ہم چار عنوانات پر تقسیم کر سکتے ہیں: تعلیم و تربیت، علمی تحقیق، دعوتِ عام اور معاشی تدابیر۔ یہاں ہم ان عنوانات کے تحت اس نقشہ کی تفصیلات بترتیب بیان کریں گے تاکہ پیشِ نظر کام کی نوعیت اور اس کی عملی صورت اچھی طرح واضح ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس کام کو چلانے اور فروغ دینے کے لیے کس قسم کے آدمیوں اور کن وسائل و ذرائع کی ضرورت ہے۔ "جماعتِ اسلامی" کے تحت جو جماعتیں ہندوستان کے مختلف مقامات پر قائم ہیں ان کے امراء کو چاہیے کہ اپنی اپنی جماعتوں کو مجتمع کر کے یہ نقشہ ان کے سامنے پیش کریں اور اپنے ارکان کی صلاحیتوں اور اپنے جماعتی وسائل کا پوری طرح جائزہ لے کر مرکز کو مطلع کریں کہ کس کس شعبہ میں کام کرنے کے لیے ان کے پاس کس کس قابلیت کے آدمی موجود ہیں اور ہر جماعت ان کاموں کو چلانے کے لیے کیا وسائل بہم پہنچا سکتی ہے۔ جہاں جماعتیں موجود نہیں ہیں اور صرف ارکان انفرادی حیثیت میں موجود ہیں وہاں ہر فردِ جماعت بطورِ خود اس نقشہ کو پیشِ نظر رکھ کر اپنا اور اپنے ذرائع کا جائزہ لے اور ہمیں بتائے کہ وہ اس سلسلہ میں کیا کام کر سکتا ہے یا کیا ذرائع بہم پہنچا سکتا ہے۔ نیز جو لوگ جماعت میں شریک نہیں ہیں مگر اس کام سے دلچسپی اور ہمدردی رکھتے ہیں وہ بھی اگر کسی حیثیت سے اس میں حصہ لینا چاہیں تو ہمیں مطلع فرما دیں کہ وہ کس نوعیت کا اور کتنا حصہ لینے کے لیے تیار ہیں۔ یہ اطلاعات ہمیں وسطِ اگست تک مل جانی چاہئیں۔ پھر ان سب پر غور کرنے کے بعد جن کو یہاں کام کرنے کے لیے منتخب کیا جائے گا انھیں یہاں بلا لیا جائے گا اور جنھیں باہر کوئی کام تفویض کرنا ہو گا انھیں بھی اطلاع دیدی جائے گی۔

سب سے پہلا کام جو ہم یہاں کرنا چاہتے ہیں ایک درسگاہ و تربیت گاہ کا قیام ہے۔ میں نے اپنے مضمون "نیا نظامِ تعلیم" اور "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" میں اس حقیقت کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ کوئی تحریک جو

انسانی زندگی میں ایک مکمل اور حقیقی انقلاب برپا کرنا چاہتی ہو کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خود اپنے مزاج اور اپنے مقتضیات کے مطابق انسانوں کو ڈھالنے اور بنانے کے لیے تعلیم و تربیت کا ایک نظام قائم نہ کرے۔ پھر میں پہلے مضمون میں تفصیل کے ساتھ اور دوسرے میں مجملاً یہ بھی بتا چکا ہوں کہ ہمیں اپنی تحریک کے لیے کس طرح کا نظام تعلیم و تربیت درکار ہے۔ اب اُن کہی ہوئی باتوں کے اعادہ کی حاجت نہیں، صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ جو کچھ اس وقت کہا گیا تھا اب اُسے کرنے کا ارادہ ہے چند رفقاء کے مشورہ سے، جو فن تعلیم کو علمی حیثیت سے بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور عملی تجربہ بھی رکھتے ہیں، میں نے اس درسگاہ کا ایک خاکہ مرتب کر لیا ہے اور خود اپنے دو بچوں سے عملاً اس کی بنا بھی ڈال دی ہے۔ بنیادی اصول وہی ہیں جو اِن دونوں مضامین میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ عملی تفصیلات ابھی اس قابل نہیں ہیں کہ انھیں بتمام و کمال اسی مرحلہ میں شائع کر دیا جائے۔ تجربہ سے ابھی ان میں بہت کچھ ردوبدل ہونا ہے۔ جب ہمارا تجربہ کامیاب ہو جائے گا اور ہم خود اس پر مطمئن ہو جائیں گے تو انشاء اللہ اپنا تعلیمی دستور اور نصاب دونوں شائع کر دیں گے۔ تاہم اس کے سرسری خط و خال یہاں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

زمانہ تعلیم کو ہم نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اساسی، متوسط اور عالی۔

اساسی تعلیم میں ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ہر انسان کو مسلم انسان ہونے کی حیثیت سے دنیا کا کام چلانے کے لیے لازماً جن معلومات، جن اخلاقی اوصاف، اور جن ذہنی اور عملی استعدادوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے بچہ کی شخصیت میں جمع کر دی جائیں۔ ہم اس کو صرف کتاب ہی نہیں پڑھائیں گے بلکہ ہمارا استاد عملاً اس کو اپنی معلومات اور اپنی قابلیتوں سے زندگی کے مختلف شعبوں میں کام لینا سکھائے گا اور اس کو اس قابل بنائے گا کہ اساسی تعلیم کے مرحلہ سے فارغ ہو کر جب وہ نکلے تو ہر شعبۂ حیات میں وہ ایک عمدہ ابتدائی کارکن بن سکے، اس کی ذہنی اور جسمانی قوتوں میں سے کوئی قوت ایسی نہ ہو جس کا استعمال اسے نہ آتا ہو، اور زندگی کی مختلف راہوں میں سے کوئی راہ ایسی نہ ہو جس پر چلنے کے لیے کم از کم ناگزیر معلومات اس کے پاس نہ ہوں۔ علاوہ بریں ہم اسے اتنی عربی بھی سکھائیں گے کہ وہ قرآن کا سیدھا سادہ مفہوم خود سمجھ لے، نیز تعلیم اور تربیت دونوں کے ذریعہ سے

ہم اس کو اسلامی طرز زندگی کے ضروری آداب و اطوار اور قواعد و قوانین سے بھی نہ صرف آگاہ کر دیں گے بلکہ عملاً ان کا خوگر بنا دیں گے۔ یہ تعلیم تمام بچوں کے لیے یکساں ہوگی کیونکہ ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ اس مرتبہ کی تعلیم و تربیت ہر بچے کو حاصل ہونی چاہیے قطع نظر اس سے کہ آگے چل کر اسے دنیا میں مزدور یا کسان کی حیثیت سے کام کرنا ہے یا وزیر کی حیثیت سے یا پروفیسر کی حیثیت سے۔

متوسط تعلیم میں بچہ کے داخل ہونے کا انحصار اساسی تعلیم کے نتائج پر ہوگا۔ اساسی تعلیم کی انتہا کو پہنچتے پہنچتے ہر بچہ کے متعلق اندازہ کر لیا جائے گا کہ آیا وہ دنیا کی زندگی میں ابتدائی کارکن کے مرتبہ سے بلند تر خدمات انجام دینے کی قوت رکھتا ہے یا نہیں۔ جن بچوں کے متعلق استادوں کا تخمینہ اور آزمائشی امتحانات کا فیصلہ یہ ہوگا کہ وہ ایسی قوت رکھتے ہیں صرف انہی کو دوسرے مرحلۂ تعلیمی میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی، اور اس مرحلہ میں ہمارے پیش نظر یہ ہوگا کہ بچوں کو اُن کاموں کے لیے تیار کیا جائے جن میں جسمانی قوتوں کی بہ نسبت ذہنی قوتوں سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے۔ یہاں ہر بچہ کے لیے ان مضامین کا مجموعہ تجویز کیا جائے گا جن کے ساتھ اس کے ذہن کو مناسبت ہوگی جس شعبۂ زندگی کے لیے اسے تیار کرنا ہوگا اسی سے تعلق رکھنے والے علوم عالیہ کے مبادی اُسے پڑھائے جائیں گے، مگر اس طرح کہ ہر دنیوی علم کے اندر دینی نقطۂ نظر روح کی طرح جاری و ساری ہوگا اور ہر دینی علم کا انطباق دنیوی حالات پر کر کے بتایا جائے گا۔ پھر طالب علم کو اپنے علم سے عملاً کام لینے کی پوری مشق بھی کرائی جائے گی اور تربیت کے ذریعہ سے اس میں ایک سچے مسلمان کی سیرت بھی پیدا کی جائے گی۔

درجہ... کی تعلیم بالکل اختصاصی تعلیم ہوگی اور اس میں ہمارے پیش نظر ایسے علماء اور راہبر پیدا کرنا ہوگا جو زندگی کے مختلف شعبوں میں قیادت و رہنمائی کے اہل ہوں، جن میں یہ قابلیت ہو کہ اسلام کے اصولوں پر ایک پورے نظامِ تمدن کی تعمیر کر سکیں اور ایک جدید ترین اسٹیٹ کی تنظیم کا بار اٹھا سکیں۔ اس کے لیے جس علم، جس قوت اجتہاد، اور جس متقیانہ سیرت کی ضرورت ہے وہ ان میں تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے پیدا کی جائیگی۔

اور اس درجہ میں صرف وہی طلبہ لیے جائیں گے جن کے متعلق متوسط تعلیم کے نتائج سے یہ اطمینان ہو جائیگا کہ وہ اپنی ذہنی و اخلاقی صلاحیتوں کے اعتبار سے اس کے اہل ہیں۔

علمی تحقیق کا شعبہ دراصل ہماری تحریک کا دل اور دماغ ہوگا۔ اب تک اس تحریک کا علمی کام تنہا میں ہی کرتا رہا ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک اکیلا آدمی ایسی ایک ہمہ گیر و عالمگیر تحریک کے لیے علمی و فکری بنیاد فراہم کرنے کی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ اگر ہمیں واقعی نظامِ تمدن و اخلاق میں کوئی انقلاب برپا کرنا ہے تو ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ صرف اردو زبان ہی میں نہیں بلکہ متعدد دوسری زبانوں اور خصوصاً دو تین بین الاقوامی زبانوں میں بھی ایسا لٹریچر فراہم کریں جو اسلامی نظام کی پوری شکل و صورت سے دنیا کو آشنا کرے، اور اپنی تنقید سے موجودہ تہذیب و تمدن کی جڑیں اکھاڑ کر دلوں اور دماغوں میں نظامِ اسلامی کی صداقت کا یقین اور اس کے قیام کی خواہش پیدا کر دے۔ نیز ہمیں قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ اسلام کے متعلق جملہ علوم کی تدوینِ جدید کرنی ہوگی، اور اسی طرح علومِ جدیدہ کو بھی اسلامی نقطۂ نظر سے از سرِ نو مدون کرنا ہوگا۔ یہ کام کیے بغیر ہم ہرگز یہ توقع نہیں کر سکتے کہ مجرد کسی عمومی یا عسکری تحریک سے کوئی حقیقی اسلامی انقلاب دنیا کے موجودہ نظامِ تمدن و اخلاق میں رونما ہو جائے گا۔

اس غرض کے لیے ہم کو ایک طرف ایسے صاحبِ فکر و نظر آدمیوں کی ضرورت ہے جو اس تحقیقی کام کے اہل ہوں اور ہمارے جماعتی نظم و ضبط کے اندر رہ کر یہ خدمت انجام دے سکیں۔ دوسری طرف ایک عمدہ کتب خانہ درکار ہے، اور اس کے ساتھ ایسے ذرائع درکار ہیں جن سے ہم ان خدامِ دین کو سامانِ زیست بہم پہنچا سکیں۔

سرِ دست ہم صرف اساسی تعلیم کی درسگاہ قائم کر رہے ہیں۔ اونچے درجوں کے کچھ طلبہ اگر اس مرحلہ پر

آجائیں تو ہم کوشش کریں گے کہ ان کے لیے بھی ایک عارضی نصاب بنا کر تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کردیں لیکن ہمارے نظام تعلیم کا حقیقی نشوونما اساسی تعلیم ہی سے ہوگا۔ اس درسگاہ کی تعمیر کے لیے ابتدائی مصارف تقریباً ڈیڑھ ہزار ہوں گے۔ ماہانہ مصارف کا تخمینہ ۸۰۰ روپیہ ہے۔ کم از کم ۶۰ طلبہ سے ہم اس کا افتتاح کرسکتے ہیں۔ ذی استطاعت اصحاب سے فی بچہ ۲۰ روپے ماہوار لیے جائیں گے اور کم استطاعت لوگوں سے دس روپے ماہوار، لیکن کم اور زیادہ فیس دینے والے طلبہ کے درمیان قیام و طعام وغیرہ کے لحاظ سے کوئی فرق نہ رکھا جائے گا۔ استاد صرف وہی لیے جائیں گے جو جماعت اسلامی کے نظام میں شامل ہیں، ہماری تحریک کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور نہ صرف اصول و مقصد میں ہم سے متفق ہیں بلکہ ہمارے ڈسپلن کو بھی قبول کرتے ہیں۔ کچھ استادوں کا انتخاب کیا جا چکا ہے، مگر ہم پوری جماعت کا جائزہ لے کر معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے رفقاء میں کون کون لوگ ایسے ہیں جو ابتدائی تعلیم سے فنی واقفیت، حقیقی دلچسپی اور عملی تجربہ رکھتے ہیں۔

ان دونوں تعمیری کاموں کے ساتھ ہم دعوتِ عام کا کام بھی پوری قوت کے ساتھ چلانا چاہتے ہیں۔ ہماری تعمیری کوششیں بے سود ہو جائیں گی اگر ساتھ ساتھ ان کی پشت پر ایک مضبوط رائے عام بھی تیار نہ ہوتی رہے۔ جس طرح مذکورۂ بالا تعمیری کاموں کے بغیر کوئی اسلامی انقلاب رونما نہیں ہو سکتا اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ عامۃ الناس میں اسلام کی دعوت پھیلائے بغیر ایسا کوئی انقلاب برپا ہو سکے۔ ہمیں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ حتی الامکان دنیا کے گوشے گوشے میں اپنی آواز پہنچانی ہوگی کیونکہ آج کسی ایک ملک میں کوئی حقیقی انقلاب واقع نہیں ہو سکتا جب تک کہ وسیع پیمانہ پر بین الاقوامی رائے عام اس کی تائید میں تیار نہ کرلی جائے۔ اربوں انسانوں کو ہمارے پیغام سے واقف ہونا چاہیے، کروڑوں انسانوں کو کم از کم اس حد تک اس سے متاثر ہو جانا چاہیے کہ وہ اُس چیز کو حق مان لیں جس کے لیے ہم اٹھ رہے ہیں، لاکھوں انسانوں کو ہماری پشت پر اخلاقی اور عملی تائید کے لیے آمادہ ہونا چاہیے، اور ایک کثیر تعداد ایسے سرفروشوں

کی تیار ہونی چاہیے جو بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اس مقصدِ عظیم کے لیے کوئی خطرہ، کوئی نقصان، کوئی مصیبت برداشت کرنے میں تامل نہ کریں۔ اس قسم کی دعوتِ عام شروع کرنے کے لیے ابتداءً ضروری ہے کہ چھوٹے پیمانہ پر ایک محدود حلقہ میں کچھ نمونہ کا کام کیا جائے اور داعیوں کی اخلاقی و علمی تربیت کر کے اس حلقہ میں اُن سے کام لیا جائے تاکہ آئندہ وسیع پیمانہ پر دعوت پھیلانے کی راہ کھل جائے۔ اگرچہ اس ضرورت کا احساس ہمیں پہلے بھی تھا، لیکن گذشتہ ایک سال کے جماعتی کام سے جو تجربہ حاصل ہوا ہے اس کی بنا پر ہم کسی تاخیر کے بغیر اس شعبہ کی بنا رکھ دینا چاہتے ہیں

دعوتِ عام کے شعبہ میں کام کرنے کے لیے تمام بیرونی جماعتوں کو اپنے اپنے ارکان کا جائزہ لے کر بہر دست ایسے ایک ایک دو دو آدمیوں کا انتخاب کرنا چاہیے جو اس کام کے لیے موزوں تر ہوں اور ان کی صفات و خصوصیات سے مرکز کو مطلع کرنا چاہیے۔ نیز یہ بھی بتانا چاہیے کہ وہ کتنی مدت کے لیے یہاں آکر رہ سکتے ہیں، ان کی ضروریات کیا ہیں، ان کی ذات پر کس قسم کی ذمہ داریوں کا بار ہے، اور یہ کہ وہ خود یا مقامی جماعت کے ارکان کس حد تک ان کی ضروریات کے کفیل ہو سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہمیں یہاں کم از کم ایک ہومیوپیتھک ڈاکٹر اور ایک یونانی طبیب کی ضرورت ہے جو محض خدا کے بھروسہ پر اپنے شہری مطب کو ختم کر کے اس جنگل میں آبسیں، جیسا بُرا یا بھلا مطب یہاں چل سکتا ہو اُس پر بخوشی قناعت کریں، پوری خدا ترسی اور خالص انسانی ہمدردی کے ساتھ گرد و پیش کی آبادی کو طبی امداد بہم پہنچائیں اور اپنے اخلاقِ حسنہ سے دلوں میں گھر پیدا کریں۔ جماعت میں جو حکیم اور ڈاکٹر ایسے موجود ہوں جو اس ایثار کے لیے اپنے نفس کو آمادہ پاتے ہوں وہ ہمیں اپنے ارادہ سے مطلع فرمائیں۔

ظاہر ہے کہ اوپر جن کاموں کا ذکر کیا گیا ہے ان سب کے لیے مالی ذرائع درکار ہیں اور یہاں ان کا

فقدان ہے۔ اتنے بڑے کاموں کے لیے جس اجتماعی اعانت کی ضرورت ہوتی ہے وہ نہ ہمیں اب تک بہم پہنچی ہے، نہ آئندہ اس کی توقع ہے، نہ ہم وہ تدبیریں اختیار کرسکتے ہیں جن سے وہ بہم پہنچا کرتی ہے، اور نہ ہمیں اُن لوگوں سے کسی مدد کی امید رکھنے کا کوئی حق ہے جن کا مقصدِ زندگی وہ نہیں ہے جو ہمارا ہے۔ چند اہلِ خیر ایسے ضرور ہیں جو ہماری درخواست کے بغیر محض حسبۃً للہ کچھ نہ کچھ بھیجتے رہتے ہیں، مگر یہ اعانت اب تک کے جماعتی کاموں کے لیے بھی ناکافی تھی کجا کہ آئندہ جو کام پیشِ نظر ہیں ان کے لیے یہ کچھ بھی کفایت کرسکے۔ اس وقت تک جو کچھ بھی کام ہوا ہے وہ زیادہ تر جماعت کے بک ڈپو کی آمدنی سے ہوا ہے اور وہ بھی کچھ بہت زیادہ نہیں ہے کہ اس کے بل پر کام میں اتنی توسیع ہوسکے۔ اب اس کارِ عظیم کے لیے جو ذرائع مطلوب ہیں ان کی بہم رسانی دو ہی صورتوں سے ممکن ہے۔ ایک یہ کہ جو لوگ جماعتِ اسلامی میں شریک ہوئے ہیں اور جو لوگ اس کے نصب العین سے ہمدردی رکھتے ہیں وہ اس راہ میں مالی قربانیاں کرنے کے لیے آمادہ ہوجائیں اور اُن باطل پرستوں سے سبق لیں جو آج اپنے باطل نظریات کا اقتدار قائم کرنے یا قائم رکھنے کے لیے کروروں پونڈ روزانہ آگ میں پھونک رہے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ پرستارانِ باطل کی ان قربانیوں کے مقابلہ میں اگر پرستارانِ حق کچھ بھی قربانی نہ کریں اور اپنے ذاتی مفاد ہی کی پرستش کرتے رہیں تو قانونِ فطرت کے تحت یہ قطعی ناممکن ہے کہ ہمیں باطل کے مقابلہ میں اُس حق کو فروغ دینے میں کامیابی حاصل ہوجائے جس پر ہم ایمان لائے ہیں۔۔۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہماری جماعت میں جو لوگ کسی قسم کے صنعتی یا تجارتی کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں وہ یہاں آئیں اور اپنی قابلیتوں سے کام لے کر دولت پیدا کریں اور اس کا ایک حصہ اپنی ذات پر اور دوسرا حصہ اپنے مقصدِ زندگی کی خدمت پر صرف کریں۔

اسی غرض کیلیے ہم نے اپنے پروگرام میں ایک مدِ معاشی تدبیر کی بھی رکھی ہے۔ یہاں زمین بافراط موجود ہے اور نہایت شاداب و زرخیز ہے، بجلی موجود ہے، بڑی بڑی منڈیاں قریب ہیں، ذرائع حمل و نقل جنگی مشکلات کے باوجود اس وقت تک یہاں دستیاب ہورہے ہیں۔ متعدد زراعتی، صنعتی اور تجارتی کام قلیل یا کثیر سرمایہ سے یہاں شروع کیے جاسکتے ہیں۔ مقامی جماعتوں کے امرا اپنی اپنی جماعتوں کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ان کے رفقاء میں سے کون لوگ کیا کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور کس قدر وسائل ان کی دسترس میں ہیں۔ اس باب میں ان کی رپورٹیں وصول ہونے کے بعد ہم ہر ایک کو اسکے حالات کے مطابق مشورہ دینگے اور جس قدر سہولتیں مرکزی ادارہ کی طرف سے بہم پہنچائی جاسکتی ہیں وہ پہنچائی جائیں گی۔

تفہیم القرآن

(۱۴)

البقرہ

(از رکوع ۲۴ تا رکوع ۳۲)

لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہو یہ انسان کے لیے تاریخوں کے تعین کی اور حج کی علامتیں ہیں۔[۱] نیز اُن سے کہو، یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں پیچھے کی طرف سے داخل ہوتے ہو۔ نیکی تو اصل میں یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ناراضی سے بچے۔ لہٰذا تم اپنے گھروں میں دروازے ہی سے آیا کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو شاید کہ

---

[۱] چاند کا گھٹنا بڑھنا ایک ایسا منظر ہے جس نے ہر زمانہ میں انسان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ اور اس کے متعلق طرح طرح کے اوہام، تخیلات اور رسوم دنیا کی قوموں میں رائج رہے ہیں اور اب تک رائج ہیں۔ اہلِ عرب میں بھی اس قسم کے اوہام موجود تھے۔ چاند سے اچھے یا بُرے شگون لینا، بعض تاریخوں کو سعد اور بعض کو نحس سمجھنا، کسی تاریخ کو سفر کے لیے اور کسی کو ابتدائے کار کے لیے اور کسی کو شادی بیاہ کے لیے منحوس یا مسعود خیال کرنا، اور یہ سمجھنا کہ چاند کے طلوع وغروب اور اس کی کمی وبیشی اور اس کی حرکت اور اس کے گہن کا کوئی اثر انسانی قسمتوں پر پڑتا ہے، یہ سب باتیں دوسری جاہل قوموں کی طرح اہلِ عرب میں بھی پائی جاتی تھیں اور اس سلسلہ میں مختلف توہم پرستانہ رسمیں اُن میں رائج تھیں۔ انہی چیزوں کی حقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کی گئی۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ گھٹتا بڑھتا چاند تمہارے لیے اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک قدرتی جنتری ہے جو آسمان پر نمودار ہو کر دنیا بھر کے آدمیوں کو بیک وقت ان کی تاریخوں کا حساب بتاتی رہتی ہے۔ حج کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ عرب کی مذہبی، تمدنی اور معاشی زندگی میں اس کی اہمیت سب سے بڑھ کر تھی۔ سال کے کئی مہینے حج ہی سے وابستہ تھے اور ان مہینوں میں لڑائیاں بند رہتیں، راستے محفوظ ہوتے اور امن کی وجہ سے کاروبار فروغ پاتے تھے۔

تمھیں فلاح نصیب ہو جائے۔[1]

اور تم اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں[2]، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا[3]۔ اُن سے لڑو جہاں بھی تمھارا اُن سے مقابلہ پیش آئے اور اُنھیں نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے، اس لیے کہ قتل اگرچہ بُرا ہے مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ اور مسجدِ حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں تم بھی نہ لڑو، مگر جب وہ وہاں لڑنے سے نہ چوکیں تو تم بھی بے تکلف اُنھیں مارو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز

---

[1] منجملہ اُن توہم پرستانہ رسموں کے جو عرب میں رائج تھیں، ایک یہ بھی تھی کہ جب حج کے لیے احرام باندھ لیتے تو اپنے گھروں میں دروازے سے داخل نہ ہوتے تھے بلکہ پیچھے سے دیوار کود کر یا دیوار میں کھڑکی سی بنا کر داخل ہوتے تھے۔ نیز سفر سے واپس آکر بھی گھروں میں پیچھے سے داخل ہوا کرتے تھے۔ اس آیت میں نہ صرف اس رسم کی تردید کی گئی ہے بلکہ تمام اوہام پر یہ کہہ کر ضرب لگائی گئی ہے کہ نیکی دراصل اللہ سے ڈرنے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے بچنے کا نام ہے۔ اُن بے معنی رسموں کو نیکی سے کوئی واسطہ نہیں جو محض باپ دادا کی اندھی تقلید میں برتی جا رہی ہیں اور جن کا انسان کی سعادت و شقاوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

[2] یعنی جو لوگ خدا کے کام میں تمھارا راستہ روکتے ہیں اور اس دین کی اشاعت اور اس کے قیام میں مزاحمت کر رہے ہیں اُن سے جنگ کرو۔ اس سے پہلے تک مسلمانوں کو صرف دعوت و تبلیغ کرنے کا حکم تھا اور مخالفین کے ظلم و ستم پر صبر کرنے کی ہدایت کی جاتی تھی۔ اب ان کو پہلی مرتبہ حکم دیا جا رہا ہے کہ جو لوگ تمھارے اس دین کی راہ میں مزاحم ہو رہے ہیں اُن کو تلوار کا جواب تلوار سے دو۔ اس کے بعد ہی جنگِ بدر پیش آئی اور لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

[3] یعنی تمھاری جنگ نہ تو اپنی مادی اغراض کے لیے ہو، نہ اُن لوگوں پر ہاتھ اُٹھایا جائے جو دینِ حق کی راہ میں مزاحمت نہیں کرتے، اور نہ لڑائی میں جاہلیت کے طریقے استعمال کیے جائیں۔ عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں اور زخمیوں کو قتل کرنا، دشمن کے مقتولوں کا مُثلہ کرنا، کھیتوں اور مویشیوں کو خواہ مخواہ برباد کرنا، اور دوسرے تمام وحشیانہ اور ظالمانہ افعال حد سے گذرنے کی تعریف میں آتے ہیں اور حدیث میں اِن سب کی ممانعت وارد ہے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ قوت کا استعمال وہیں کیا جائے جہاں وہ ناگزیر ہو، اور اسی حد تک کیا جائے جتنی اس کی ضرورت ہو۔

آجائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے؎۔

تم اُن سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے؎،

پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سِوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں؎۔ ماہِ حرام کا بدلہ

؎ یعنی تم جس خدا پر ایمان لائے ہو اس کی صفت یہ ہے کہ بدتر سے بدتر مجرم اور گنہگار کو بھی معاف کر دیتا ہے جبکہ وہ اپنی باغیانہ روش سے باز آجائے۔ یہی صفت تم اپنے اندر بھی پیدا کرو۔ تخلقوا باخلاق اللہ۔ تمھاری لڑائی انتقام کی پیاس بجھانے کے لیے نہ ہو بلکہ خدا کے دین کا راستہ صاف کرنے کے لیے ہو جب تک کوئی گروہ راہِ خدا میں مزاحم رہے بس اسی وقت تک اس سے تمھاری لڑائی بھی رہے۔ اور جب وہ اپنا رویہ چھوڑ دے تو تمھارا ہاتھ بھی پھر اُس پر نہ اُٹھے۔

؎ فتنہ کے اصل معنی آزمانے اور امتحان کرنے کے ہیں۔ سُنار جب سونے کو کٹھالی میں ڈال کر تپاتا ہے تو اسے فتنہ کہتے ہیں کیونکہ وہ اُسے آگ کی آزمائش میں ڈال کر دیکھتا ہے کہ اس میں کھوٹ ہے یا نہیں۔ اسی معنی کی مناسبت سے اُس حالت کو یہاں فتنہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جب کہ کفار برسرِ اقتدار ہوں، کفر کے احکام جاری ہو رہے ہوں، اور خدا پر ایمان رکھنے والے اُن کے قہر و غلبہ کی وجہ سے احکامِ الٰہی پر کلاً یا جزءً عمل نہ کر سکتے ہوں، کیونکہ اس حالت میں مومن کا ایمان بھی سخت آزمائش میں پڑ جاتا ہے۔

دین کے اصل معنی اطاعت کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد انسان کا یہ طرزِ عمل ہے کہ وہ کسی بالاتر اقتدار اور کسی بالاتر قانون کو تسلیم کر کے باضابطگی کے ساتھ اس کی اطاعت میں زندگی بسر کرے۔ ایسے ہر نظامِ اطاعت و بندگی کو دین کہا جائے گا قطع نظر اس سے کہ وہ دینِ حق ہو یا دینِ باطل۔

لہٰذا اس آیت کی رُو سے اسلامی جنگ کی غایت یہ قرار پائی کہ فتنہ کی حالت (یعنی غلبۂ کفر و کفار کی حالت) ختم ہو جائے اور اطاعت و بندگی کا پورا نظام اللہ کے لیے خالص ہو کر رہے۔

؎ باز آجانے سے مراد کافروں کا اپنے کفر و شرک سے باز آجانا نہیں بلکہ فتنہ سے باز آجانا ہے۔ کافر، مشرک، دہریے ہر ایک کو اختیار ہے کہ اپنا جو عقیدہ رکھتا ہے رکھے، اور جس کی چاہے عبادت کرے، یا کسی کی نہ کرے۔ اس گمراہی سے اس کو نکالنے کے لیے ہم اُسے فہمائش اور نصیحت کریں گے مگر اس سے لڑیں گے نہیں۔ لیکن اسے یہ حق ہرگز نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کے قانون کے بجائے اپنے باطل قوانین جاری کرے اور خدا کے بندوں کو غیر از خدا

(باقی صفحہ ۲۲۰ پر)

ماہِ حرام ہی ہے[۱۹۸] اور تمام حرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہی ہوگا، لہٰذا جو تم پر دست درازی کرے تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو، البتہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ اللہ انھی لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کی حدود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔[۱۹۹] احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے[۲۰۰]۔

اللہ کی خوشنودی کے لیے جب حج اور عمرے[۲۰۱] کی نیت کرو تو اُسے پورا کرو۔ اور اگر کہیں گھر جاؤ[۲۰۲]

(بقیہ صفحہ سابق) کسی کا بندہ بنائے۔ یہ فتنہ بزور شمشیر مٹایا جائے گا اور مومن کی تلوار اُس وقت تک نیام میں نہ جائے گی جب تک کفار اپنی اس روش سے باز نہ آجائیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۹۸ عرب میں حضرت ابراہیم کے وقت سے یہ قاعدہ چلا آرہا تھا کہ ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم کے تین مہینے حج کے لیے مختص تھے اور رجب کا مہینہ عمرہ کے لیے خاص کیا گیا تھا اور ان چار مہینوں میں جنگ اور قتل و غارتگری ممنوع تھی تاکہ زائرین کعبہ امن و امان کے ساتھ خدا کے گھر تک جائیں اور اپنے گھروں کو واپس ہو سکیں۔ اس بنا پر ان مہینوں کو حرام مہینے کہا جاتا تھا یعنی حرمت والے مہینے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ ماہِ حرام کی حرمت کا لحاظ کفار کریں تو مسلمان بھی کریں، اور اگر وہ اس حرمت کو نظر انداز کرکے کسی حرام مہینے میں مسلمانوں پر دست درازی کریں تو مسلمان بھی پھر ماہِ حرام ہی میں بدلہ لینے کے مجاز ہیں۔

۱۹۹ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے مراد اللہ کے دین کو قائم کرنے کی سعی و جہد میں مالی قربانیاں کرنا ہے۔ اہلِ ایمان اگر اس کام میں اپنا مال صرف کرنے سے جی چرائیں اور اپنے مفاد کو عزیز تر رکھیں تو یہ اُن کے لیے دنیا میں بھی موجب ہلاکت ہے اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں وہ کفار سے مغلوب اور ذلیل ہو کر رہیں گے اور آخرت میں اُن سے سخت باز پرس ہوگی۔

۲۰۰ احسان کا لفظ حُسن سے نکلا ہے جس کے معنی کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں۔ عمل کا ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی کے سپرد جو خدمت ہو اُسے بس کر دے۔ اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ اسے خوبی کے ساتھ کرے، اپنی پوری قابلیت اور اپنے تمام وسائل اس میں صرف کر دے اور دل و جان سے اس کی تکمیل کی کوشش کرے۔ پہلا درجہ محض طاعت کا درجہ ہے جس کے لیے صرف تقویٰ اور خوف کافی ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا درجہ احسان کا درجہ ہے جس کے لیے محبت اور گہرا قلبی لگاؤ درکار ہوتا ہے۔

۲۰۱ کعبہ کی زیارتیں دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو ذی الحجہ کے چند مقرر دنوں میں کی جاتی ہے (باقی صفحہ ۲۲۱ پر)

تو جو قربانی میسّر آئے[۵۵] اللہ کی جناب میں پیش کرو اور اپنا سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔[۵۶] مگر جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا پر اپنا سر منڈوا لے تو اُسے چاہیے کہ فدیہ کے طور پر روزے رکھے، یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔[۵۷] پھر اگر تمھیں امن نصیب ہو جائے[۵۸] (اور تم حج سے پہلے مکہ پہنچ جاؤ) تو جو شخص تم میں سے حج کا زمانہ آنے تک عمرہ کا فائدہ اُٹھائے وہ حسبِ مقدور قربانی دے، اور جو قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے حج کے زمانہ میں اور سات گھر پہنچ کر، اس طرح پورے دس روزے رکھ لے۔ یہ رعایت اُن لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر بار مسجدِ حرام کے قریب نہ ہوں۔[۵۹] اللہ کے ان احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور خوب

(بقیہ صفحہ ۲۲۰) اس کا نام حج ہے۔ اور دوسری وہ جو ان مقرر ایام کے ماسوا دوسرے دنوں میں کی جاتی ہے۔ یہ عمرہ ہے۔

۵۴ یعنی اگر راستہ میں کوئی سبب ایسا پیش آجائے جس کی وجہ سے آگے جانا غیر ممکن ہو اور مجبوراً رُک جانا پڑے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۵۵ یعنی اونٹ، گائے، بکری میں سے جو میسر آئے۔

۵۶ اس امر میں اختلاف ہے کہ جگہ سے کیا مراد ہے۔ فقہائے حنفیہ کے نزدیک اس سے مراد حرم ہے یعنی اگر آدمی راستہ میں رُک جانے پر مجبور ہو تو اپنی قربانی کا جانور یا اس کی قیمت بھیج دے تاکہ اس کی طرف سے حدودِ حرم میں قربانی کی جائے۔ اور امام مالک و شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک جہاں آدمی گھر گیا ہو وہیں قربانی کر دینا مراد ہے۔

۵۷ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورت میں تین دن کے روزے رکھنے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلانے یا کم از کم ایک بکری ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔

۵۸ یعنی وہ سبب دور ہو جائے جس کی وجہ سے مجبوراً تمھیں راستہ میں رُک جانا پڑا تھا۔ چونکہ اُس زمانہ میں حج کا راستہ بند ہونے اور حاجیوں کے رُک جانے کا سبب زیادہ تر دشمنِ اسلام قبیلوں کی مزاحمت ہی تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اوپر کی آیت میں "گِھر جانے" اور اس کے بالمقابل یہاں "امن نصیب ہو جانے" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لیکن جس طرح "گِھر جانے" کے مفہوم میں دشمن کی مزاحمت کے علاوہ دوسرے تمام موانع شامل ہیں اسی طرح "امن نصیب ہو جانے" کا مفہوم بھی ہر مانع و مزاحم چیز کے دور ہو جانے پر حاوی ہے۔ (باقی حواشی صفحہ ۲۲۲ پر)

۶۰ جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے

حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ جو شخص ان مقرر مہینوں میں حج کا فیصلہ کرے اُسے خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل[۱]، کوئی بدکاری[۲]، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات[۳] سرزد نہ ہو۔ اور جو نیک کام تم کروگے وہ اللہ کے علم میں ہوگا۔ سفر حج کے لیے زاد راہ ساتھ لے جاؤ، اور سب سے بہتر زادِ راہ پرہیزگاری ہے۔ پس اے ہوشمندو! میری نافرمانی سے پرہیز کرو۔ اور اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں[۵]۔

(بقیہ صفحہ ۲۲۱) ۵۸ عرب جاہلیت میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ دونوں ادا کرنا گناہ عظیم ہے۔ ان کی خود ساختہ شریعت میں عمرہ کے لیے الگ اور حج کے لیے الگ سفر کرنا ضروری تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس قید کو اڑا دیا اور باہر سے آنے والوں کے ساتھ یہ رعایت فرمائی کہ وہ ایک ہی سفر میں عمرہ اور حج دونوں کرلیں۔ البتہ جو لوگ مکہ کے آس پاس میقاتوں کی حدود کے اندر رہتے ہوں انھیں اس رعایت سے مستثنیٰ کر دیا کیونکہ اُن کے لیے عمرہ کا سفر الگ اور حج کا سفر الگ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

حج کا زمانہ آنے تک عمرہ کا فائدہ اٹھانے سے مراد یہ ہے کہ آدمی عمرہ کرکے احرام کھول لے اور اُن پابندیوں سے آزاد ہو جائے جو احرام کی حالت میں لگائی گئی ہیں، پھر جب حج کے دن آئیں تو از سر نو احرام باندھ لے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱ احرام کی حالت میں میاں اور بیوی کے درمیان نہ صرف تعلق زن و شو ممنوع ہے بلکہ اُن کے درمیان کوئی ایسی گفتگو بھی نہ ہونی چاہیے جو رغبتِ شہوانی پر مبنی ہو۔

۲ تمام معصیت کے افعال اگرچہ بجائے خود ناجائز ہیں لیکن احرام کی حالت میں ان کا گناہ بہت سخت ہے۔

۳ حتیٰ کہ خادم کو ڈانٹنا تک جائز نہیں۔

۴ جاہلیت کے زمانہ میں حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لے کر نکلنے کو ایک دنیا دارانہ فعل سمجھا جاتا تھا اور ایک مذہبی آدمی سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ خدا کے گھر کی طرف دنیا کا سامان لیے بغیر جائے گا۔ اس آیت میں اُن کے اِس غلط خیال کی تردید کی گئی ہے اور انھیں بتایا گیا ہے کہ زادِ راہ نہ لینا کوئی خوبی نہیں ہے۔ اصل خوبی خدا کا خوف اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے اجتناب اور زندگی کا پاکیزہ ہونا ہے۔ جو مسافر اپنا اخلاق درست نہیں رکھتا اور خدا سے بے خوف ہو کر بُرے اعمال کرتا ہے وہ اگر زادِ راہ ساتھ نہ لے کر محض ظاہر میں (باقی صفحہ ۲۲۳ پر)

پھر جب عرفات سے چلو تو مشعرِ حرام (مزدلفہ) کے پاس ٹھیر کر اللہ کو یاد کرو اور اُس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اُس نے تمھیں کی ہے، ورنہ اس سے پہلے تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔[۱] پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو،[۲] یقیناً وہ معاف کرنے والا اور

(بقیہ صفحہ سابق) فقیری کی نمائش کرے تو خدا اور خلق دونوں کی نگاہ میں وہ ذلیل ہوگا اور اپنے اُس مذہبی کام کی بھی توہین کرے گا جس کے لیے وہ سفر کر رہا ہے۔ لیکن اگر اس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور اس کے اخلاق درست ہوں تو خدا کے ہاں بھی اس کی عزت ہوگی اور خلق بھی اس کا احترام کرے گی۔

ؔ یہ بھی قدیم عربوں کا ایک جاہلانہ تصور تھا کہ سفرِ حج کے دوران میں کسبِ معاش کے لیے کام کرنے کو وہ بُرا سمجھتے تھے کیونکہ اُن کے نزدیک کسبِ معاش ایک دنیا دارانہ فعل تھا اور حج جیسے ایک مذہبی کام کے دوران میں اس کا ارتکاب مذموم تھا۔ قرآن اس خیال کی تردید کرتا ہے اور انھیں بتاتا ہے کہ ایک خدا پرست آدمی جب خدا کے قانون کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی معاش کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو دراصل اپنے رب کا فضل تلاش کرتا ہے اور کوئی گناہ نہیں اگر وہ اپنے رب کی رضا کے لیے سفر کرتے ہوئے اس کا فضل بھی تلاش کرتا جائے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۱؎ یعنی جاہلیت کے زمانہ میں خدا کی عبادت کے ساتھ جن دوسرے مشرکانہ اور جاہلانہ افعال کی آمیزش ہوتی تھی ان سب کو چھوڑ دو اور اب جو ہدایت اللہ نے تمھیں بخشی ہے اس کے مطابق خالصۃً اللہ کی عبادت کرو۔

۲؎ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا طریقہ یہ تھا کہ ۹ ذی الحجہ کو تمام حاجیوں کے ساتھ عرفات جاتے تھے اور رات کی صبح کو وہاں سے مزدلفہ کی طرف پلٹتے تھے۔ بعد کی صدیوں میں جب رفتہ رفتہ قریش کی برہمنیت قائم ہو گئی تو انھوں نے کہا ہم اہلِ حرم ہیں، ہمارے مرتبہ سے یہ بات فروتر ہے کہ عام اہلِ عرب کے ساتھ عرفات تک جائیں چنانچہ انھوں نے اپنے لیے یہ شانِ امتیاز قائم کی کہ مزدلفہ تک جا کر ہی پلٹ آتے اور عام لوگوں کو عرفات تک جانے کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ پھر یہی امتیاز بنی خزاعہ اور بنی کنانہ اور اُن دوسرے قبیلوں کو بھی حاصل ہو گیا جن کے ساتھ قریش کے شادی بیاہ کے رشتے تھے۔ آخرکار نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو قبیلے قریش کے حلیف تھے ان کی شان بھی عام عربوں سے اونچی ہو گئی اور انھوں نے بھی عرفات جانا چھوڑ دیا۔ اسی فخر و غرور کا بت اس آیت میں توڑا گیا ہے۔ آیت کا خطاب خاص قریش اور ان کے رشتہ دار اور حلیف قبائل کی طرف ہے اور خطاب عام اُن سب کی طرف ہے جو آئندہ کبھی اس قسم کے امتیازات اپنے لیے مخصوص کرنا چاہیں۔ اُن کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اور سب لوگ جہاں تک جاتے ہیں انھی کے ساتھ جاؤ، (باقی صفحہ آئندہ)

رحم کرنے والا ہے۔ پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو تو جس طرح پہلے اپنے آباؤاجداد کا ذکر کرتے تھے اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔[۵] (مگر اللہ کو یاد کرنے والے لوگوں میں بھی بہت فرق ہے) ان میں سے کوئی تو ایسا ہے جو کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا ہی میں سب کچھ دیدے۔ ایسے شخص کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور کوئی کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی، اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔ ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے، اور اللہ کو حساب چکاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ یہ گنتی کے چند روز ہیں جو تمہیں اللہ کی یاد میں بسر کرنے چاہییں، پھر جو کوئی دو دن پہلے واپس ہو گیا تو کوئی حرج نہیں، اور جو کچھ دیر زیادہ ٹھہر کر پلٹا تو بھی کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ یہ دن اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کیے ہوں[۶] ـــ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمہاری پیشی ہونے والی ہے۔

انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھیراتا ہے[۷] مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمن حق ہوتا ہے[۸]۔ جب اُسے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۳) انہی کے ساتھ ٹھیرو، انہی کے ساتھ پلٹو، اور اب تک جاہلیت کے فخر و غرور کی بنا پر سنت ابراہیمی کی جو خلاف ورزی تم کرتے رہے ہو اس پر اللہ سے معافی مانگو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵] اہل عرب حج سے فارغ ہو کر جلسے کرتے تھے جن میں ہر قبیلے کے لوگ اپنے باپ دادا کے کارنامے فخر کے ساتھ بیان کرتے اور اپنی بڑائی کی ڈینگیں مارتے تھے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ ان جاہلانہ باتوں کو چھوڑو، پہلے جو وقت فضولیات میں صرف کرتے تھے اب اسے اللہ کی یاد اور اس کے ذکر میں صرف کرو۔

[۶] یعنی ایام تشریق میں منیٰ سے مکہ کی طرف واپسی خواہ دو دن پہلے ہو خواہ دو دن بعد، دونوں صورتوں میں کوئی حرج نہیں۔ اصل اہمیت اس کی نہیں کہ تم ٹھیرے کتنے دن، بلکہ اس کی ہے کہ جتنے دن بھی ٹھیرے ان میں خدا کے ساتھ تمہارے تعلق کا کیا حال رہا۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۲۲۵ پر)

اقتدار حاصل ہو جاتا ہے[ملہ] تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتیوں کو غارت کرے۔ اور نسلِ انسانی کو تباہ کرے۔ حالانکہ اللہ (جسے وہ گواہ بنا رہا تھا) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر، تو اپنے وقار کا خیال اس کو پکڑ کر گناہ پر جما دیتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے تو بس جہنم ہی کافی ہو سکتی ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ دوسری طرف انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔ اے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ[۲۲۶] اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ جو صاف صاف ہدایات تمہارے پاس آچکی ہیں اگر اُن کو پا لینے کے بعد پھر تم نے لغزش کھائی تو خوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور بڑا حکیم و دانا ہے۔ (اگر اِن ساری نصیحتوں اور ہدایتوں کے بعد بھی لوگ سیدھے نہ ہوں تو) کیا اب وہ اس کے منتظر ہیں کہ اللہ بادلوں کا چتر لگائے فرشتوں کے پرے ساتھ لیے خود سامنے آموجود ہو

(بقیہ حواشی صفحہ ۲۲۴) ملہ یعنی کہتا ہے خدا شاہد ہے کہ میں محض طالب خیر ہوں، اپنی ذاتی غرض کے لیے نہیں بلکہ صرف حق اور صداقت اور انسانوں کی فلاح کے لیے کام کر رہا ہوں۔

ملہ اصل لفظ "اَلَدُّ الْخِصَامِ" استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں "تمام دشمنوں سے زیادہ ٹیڑھا" یعنی جو دشمنی میں ایسا اندھا ہو جائے کہ کسی جھوٹ، کسی بے ایمانی، کسی غدر و بدعہدی، غرض کسی ٹیڑھی سے ٹیڑھی چال سے بھی کام لینے میں تامل نہ کرے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ملہ اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ہم نے متن میں اختیار کیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ مزے مزے کی دل لبھانے والی باتیں بنا کر جب وہ پلٹتا ہے تو عملاً یہ کرتوت دکھاتا ہے۔

۲۲۶ یعنی کسی استثنا اور تحفظ کے بغیر اپنی پوری زندگی کو اسلام کے ماتحت لے آؤ۔ تمہارے خیالات، تمہارے نظریات، تمہارے علوم، تمہارے طور طریقے، تمہارے معاملات، اور تمہارے سعی و عمل کے راستے سب کے سب بالکل تابع اسلام ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے بعض حصوں میں اسلام کی پیروی کرو اور بعض حصوں کو اس کی پیروی سے مستثنیٰ کر لو۔

اور فیصلہ ہی کر ڈالا جائے؟[1] — آخر کار سارے معاملات پیش تو اللہ ہی کے حضور میں ہونے والے

ہیں۔ ع ۵

بنی اسرائیل سے پوچھو کیسی کھلی کھلی نشانیاں ہم نے اُنھیں دکھائی ہیں، اور پھر یہ بھی انہی

سے پوچھ لو کہ اللہ کی نعمت پانے کے بعد جو قوم اس کو شقاوت سے بدلتی ہے اُسے اللہ کیسی سخت

سزا دیتا ہے۔[2]

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے اُن کے لیے دنیا کی زندگی بڑی محبوب و دل پسند

بنا دی گئی ہے۔ ایسے لوگ ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کا مذاق اُڑاتے ہیں، مگر قیامت

---

[1] یہ الفاظ قابلِ غور ہیں کہ ان سے ایک اہم حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس دنیا میں انسان کی ساری آزمائش ہی اس امر کی ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھے بغیر مانتا ہے یا نہیں اور ماننے کے بعد اتنی اخلاقی طاقت رکھتا ہے یا نہیں کہ نافرمانی کا اختیار رکھنے کے باوجود فرماں برداری اختیار کرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی بعثت میں، کتابوں کی تنزیل میں، حتیٰ کہ معجزات تک میں عقل اور اخلاقی قوت کی آزمائش کا ضرور لحاظ رکھا ہے اور کبھی حقیقت کو اس طرح بے پردہ نہیں کر دیا ہے کہ آدمی کے لیے مانے بغیر چارہ نہ رہے کیونکہ اس کے بعد تو آزمائش بالکل بے معنی ہو جاتی ہے اور امتحان میں کامیابی و ناکامی کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ اسی بنا پر یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اس وقت کا انتظار نہ کرو جب اللہ اور اس کی سلطنت کے کارکن فرشتے خود سامنے آجائیں گے کیونکہ پھر تو فیصلہ ہی کر ڈالا جائے گا۔ ایمان لانے اور اطاعت میں سر جھکا دینے کی ساری قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت تمھارے حواس سے پوشیدہ ہے اور تم محض دلیل سے اس کو تسلیم کر کے اپنی دانشمندی کا، اور محض فہمائش سے اس کی پیروی و اطاعت اختیار کر کے اپنی اخلاقی طاقت کا ثبوت دیتے ہو۔ ورنہ جب حقیقت بے نقاب سامنے آجائے، اور تم بچشم سر دیکھ لو کہ یہ خدا اپنے تختِ جلال پر متمکن ہے، اور یہ ساری کائنات کی سلطنت اس کے فرمان پر چل رہی ہے، اور یہ فرشتے زمین و آسمان کے انتظام میں لگے ہوئے ہیں، اور یہ تمھاری ہستی اُس کے قبضۂ قدرت میں پوری بے بسی کے ساتھ جکڑی ہوئی ہے، اس وقت تم ایمان لائے اور اطاعت پر آمادہ ہوئے تو اس ایمان اور اطاعت کی قیمت ہی کیا؟ اس وقت تو کوئی کٹے سے کٹا کافر اور بدتر سے بدتر مجرم و فاجر بھی انکار و نافرمانی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ایمان لانے اور اطاعت قبول کرنے کی مہلت بس اُسی وقت تک ہے جب تک کہ پردہ کشائی کی وہ ساعت نہیں آتی اور جب (باقی صفحہ ۲۲۷ پر)

کے روز پرہیز گار مومن ہی اُن کے مقابلہ میں عالی مقام ہوں گے۔ رہا دنیا کا رزق تو اللہ کو اختیار ہے جسے چاہے بے حساب دے۔

ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقہ پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کجروی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے، اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے اُن کا فیصلہ کرے۔ (اور ان اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا۔ نہیں) اختلاف ان لوگوں نے کیا جنھیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انھوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔[1]

(بقیہ صفحہ سابق) وہ ساعت آگئی تو پھر نہ مہلت ہے نہ آزمائش، بلکہ وہ فیصلہ کا وقت ہے۔

۵۲؂ اس سوال کے لیے بنی اسرائیل کا انتخاب دو وجوہ سے کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ آثارِ قدیمہ کے بے زبان کھنڈروں کی بہ نسبت جیتی جاگتی قوم زیادہ بہتر سامانِ عبرت و بصیرت ہے۔ دوسرے یہ کہ بنی اسرائیل وہ قوم ہے جس کو کتاب اور نبوت کی مشعل دے کر دنیا کی رہنمائی کے منصب پر مامور کیا گیا تھا اور پھر اس نے دنیا پرستی، نفاق، اور علم و عمل کی ضلالتوں میں مبتلا ہو کر اس نعمت سے اپنے آپ کو محروم کر لیا۔ لہٰذا جو گروہ اس قوم کے بعد امامت کے منصب پر مامور ہوا ہے اُس کو سب سے بہتر سبق اگر کسی کے انجام سے مل سکتا ہے تو وہ یہی قوم ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ناواقف لوگ جب اپنے قیاس و گمان کی بنیاد پر "مذہب" کی تاریخ مرتب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا شرک کی تاریکیوں سے کی، پھر تدریجی ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہ تاریکی چھٹتی اور روشنی بڑھتی گئی یہاں تک کہ آدمی توحید کے مقام پر پہنچا۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان ہی کو بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور تیرے لیے صحیح راستہ کونسا ہے۔ اس کے بعد ایک مدت تک نسل آدم راہ راست پر قائم رہی اور ایک امت بنی رہی۔ پھر لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کر لیے، نہ اس لیے کہ ان کو حقیقت بتائی نہیں گئی تھی، بلکہ اس لیے کہ حق کو جاننے کے باوجود بعض لوگ اپنے جائز حق سے بڑھ کر امتیازات، فوائد اور منافع حاصل کرنا چاہتے تھے اور آپس میں (باقی صفحہ آئندہ پر)

پس جو لوگ انبیا پر ایمان لے آئے انھیں اللہ نے اپنے اذن سے اس حق کا راستہ دکھا دیا جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا، اللہ جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے۔

پھر کیا[1] تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمھیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گذرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گذر چکا ہے؟ اُن پر سختیاں گذریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی — اُس وقت انھیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔

لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ بھلائی کی راہ سے تم جو کچھ بھی خرچ کرو اپنے والدین، اقربا، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے کرو، اور جو بھلائی بھی تم کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہوگا۔

تمھیں جنگ کا حکم دیدیا گیا ہے اور وہ تمھیں ناگوار ہے — ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں ناگوار ہو

(بقیہ صفحہ سابق) ایک دوسرے پر ظلم، سرکشی اور زیادتی کرنے کے خواہشمند تھے۔ اسی خرابی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو مبعوث کرنا شروع کیا۔ یہ انبیاء اس لیے نہیں بھیجے گئے تھے کہ ہر ایک اپنے نام سے ایک نئے مذہب کی بنا ڈالے اور ایک نئی امت بنا دے بلکہ ان کے بھیجے جانے کی غرض یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے اُس کھوئی ہوئی راہِ حق کو واضح کرکے انھیں پھر سے ایک امت بنا دیں۔

(حاشیہ صفحۂ ہذا) [1] اوپر کی آیت اور اس آیت کے درمیان ایک پوری داستان ہے جسے ذکر کیے بغیر چھوڑ دیا گیا ہے کیونکہ یہ آیت خود اس کی طرف اشارہ کر رہی ہے، اور قرآن کی مکی سورتوں میں (جو سورۂ بقرہ سے پہلے نازل ہوئی تھیں) یہ داستان تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہے۔ انبیاء جب کبھی دنیا میں آئے انھیں اور ان پر ایمان لانے والے لوگوں کو خدا کے باغی و سرکش بندوں سے سخت مقابلہ پیش آیا اور انھوں نے اپنی جانیں جوکھوں میں ڈال کر باطل طریقوں کے مقابلہ میں دینِ حق کو قائم کرنے کی جدوجہد کی۔ اس دین کا راستہ کبھی پھولوں کی سیج نہیں رہا کہ آمنّا کہا اور چین سے لیٹ گئے۔ اس "آمنّا" کا قدرتی تقاضا ہر زمانہ میں یہ رہا ہے کہ آدمی جس دین پر ایمان لایا ہے اُسے قائم کرنے کی کوشش کرے (باقی صفحہ ۲۲۹ پر)

اور وہی تمھارے لیے بہتر ہو، اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند ہو اور وہی تمھارے لیے بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ ع ۲۶

لوگ پوچھتے ہیں ماہِ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو، اُس میں لڑنا بہت بُرا ہے، مگر راہِ خدا سے لوگوں کو روکنا اور خود اس سے باز رہنا، مسجدِ حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ بُرا ہے اور یہ فتنہ خونریزی سے شدید تر ہے۔[۱] وہ تو تم سے لڑے ہی جائیں گے حتیٰ کہ اگر اُن کا بس چلے تو تمھیں اس دین سے پھیر لے جائیں، (اور یہ تمھارے لیے ایسا بڑا خطرہ ہے کہ) تم میں سے جو کوئی اس دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا اس کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے سب لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔[۲] بخلاف اس کے جو لوگ ایمان لائے

(بقیہ صفحہ سابق) اور جو طاغوت اس کے راستے میں مزاحم ہو اس کا زور توڑنے میں اپنے جسم و جان کی ساری قوتیں صرف کر دے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] کفارِ مکہ اور یہودیوں کی طرف سے جو اعتراضات کیے جاتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ یہ لوگ دعویٰ تو کرتے ہیں خدا پرستی کا مگر ماہِ حرام میں بھی لڑنے سے نہیں چوکتے۔ یہ اس اعتراض کا جواب ہے۔

[۲] مسلمانوں میں سے بعض لوگ جن کے ذہن پر صلح پسندی کا ایک غلط تصور مسلط تھا کفارِ مکہ اور یہودیوں کے اعتراضات سے متاثر ہو گئے تھے۔ اس آیت میں انھیں سمجھایا گیا ہے کہ تم اپنی ان باتوں سے یہ امید نہ رکھو کہ تمھارے اور اُن کے درمیان صلح ہو جائے گی۔ اُن کا تم سے کوئی زن، زر، زمین کا جھگڑا تو ہے نہیں کہ کچھ لین دین پر صلح ہو جائے۔ اُن کو تو یہ بات کھلتی ہے کہ تم اس دین پر ایمان کیوں لائے ہو اور اس کی طرف دنیا کو دعوت کیوں دیتے ہو۔ پس جب تک وہ اپنے کفر پر اڑے ہوئے ہیں اور تم اس دین پر قائم ہو تمھارے اور ان کے درمیان صلح کیسے ہو سکتی ہے۔ ایسے دشمنوں کو تم معمولی دشمن نہ سمجھو۔ جو تم سے مال و زر یا زمین چھیننا چاہتا ہے وہ کمتر درجہ کا دشمن ہے، مگر جو تمھیں دینِ حق سے پھیرنا چاہتا ہے وہ تمھارا بدترین دشمن ہے، کیونکہ پہلا تو صرف تمھاری دنیا ہی خراب کرتا ہے لیکن یہ دوسرا تمھیں آخرت کے ابدی عذاب میں دھکیل دینے پر تلا ہوا ہے۔

ہیں اور جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور جہاد[1] کیا ہے وہ رحمتِ الٰہی کے جائز امیدوار ہیں اور اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمت سے انھیں نوازنے والا ہے۔

پوچھتے ہیں شراب اور جوے کا کیا حکم ہے؟ کہو ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں انسان کے لیے کچھ منافع بھی ہیں مگر ان کا نقصان اُن کے فائدے سے بہت زیادہ ہے[2]۔

پوچھتے ہیں ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو، جو کچھ بچا سکو۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے، شاید کہ تم دنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو۔

پوچھتے ہیں یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے[3]؟ کہو، جس طرزِ عمل میں ان کے لیے بھلائی ہو وہی

---

[1] جہاد = کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی انتہائی کوشش صرف کر دینا۔ یہ محض جنگ کا ہم معنی نہیں ہے۔ جنگ کے لیے تو "قتال" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جہاد اس سے وسیع تر مفہوم رکھتا ہے اور اس میں ہر قسم کی جدوجہد شامل ہے۔ مجاہد وہ شخص ہے جو ہر وقت اپنے مقصد کی دھن میں لگا ہو، دماغ سے اسی کے لیے تدبیریں سوچے، زبان و قلم سے اسی کی تبلیغ کرے، ہاتھ پاؤں سے اسی کے لیے دوڑ دھوپ اور محنت کرے، اپنے تمام امکانی وسائل اس کو فروغ دینے میں صرف کر دے، اور ہر اس مزاحمت کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے جو اس راہ میں پیش آئے حتیٰ کہ جب جان کی بازی لگانے کی ضرورت ہو تو اس میں بھی دریغ نہ کرے۔ اس کا نام ہے "جہاد"۔ اور جہاد فی سبیل اللہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ صرف اللہ کی رضا کے لیے اور اس غرض کے لیے کیا جائے کہ اللہ کا دین اس کی زمین پر قائم ہو اور اللہ کا کلمہ سارے کلموں پر غالب ہو جائے۔ اس کے سوا اور کوئی غرض مجاہد کے پیشِ نظر نہ ہو۔

[2] یہ شراب اور جوے کے متعلق پہلا حکم ہے جس میں صرف اظہارِ ناپسندیدگی کر کے چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ ذہن ان کی حرمت قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ بعد میں شراب پی کر نماز پڑھنے کی ممانعت آئی پھر شراب اور جوے اور اس نوعیت کی تمام چیزوں کو قطعی حرام کر دیا گیا۔

شراب کے لیے "خمر" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق اگرچہ عرفِ عام میں شراب ہی پر ہوتا ہے، لیکن اس کے حکم میں وہ سب چیزیں داخل ہیں جو انسان کی قوتِ تمیز اور قوتِ فیصلہ کو معطل کر کے اس کی باقی تمام قوتوں کو آزاد چھوڑ دیتی ہیں تاکہ وہ شترِ بے مہار کی طرح جو چاہے کرے۔ اور "جوے" کا اطلاق ہر اُس معاملہ پر ہوتا ہے جس میں (باقی صفحہ آئندہ پر)

اختیار کرنا بہتر ہے۔ اگر تم اپنا اور اُن کا خرچ اور رہنا سہنا مشترک رکھو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، آخر وہ تمھارے بھائی بند ہی تو ہیں۔ بُرائی کرنے والے اور بھلائی کرنے والے، دونوں کا حال اللہ پر روشن ہے۔ اللہ چاہتا تو اس معاملہ میں تم پر سختی کرتا مگر وہ صاحب اختیار ہونے کے ساتھ صاحب حکمت بھی ہے۔

تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں، مشرک شریف زادی سے مومن لونڈی بہتر ہے اگرچہ وہ تمھیں کتنی ہی پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں، مشرک شریف سے مومن غلام بہتر ہے اگرچہ وہ تمھیں کتنا ہی پسند ہو۔ یہ لوگ آگ کی طرف بُلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بُلاتا ہے[۱]۔ اُس نے اپنی نشانیاں لوگوں کے سامنے کھول کر رکھ دی ہیں، شاید کہ وہ سبق لیں اور

(بقیہ سابق) ایک آدمی کا مال دوسرے آدمی کو محض بربنائے اتفاق ملتا ہے بغیر اس کے کہ لینے والا کسی تمدنی خدمت کی بنا پر اس کا مستحق ہو یا دینے والے کو اس مال کے معاوضہ میں کوئی تمدنی فائدہ حاصل ہو۔

[۱۰] قرآن میں یتیموں کے حقوق کی حفاظت کا بار بار سختی کے ساتھ حکم دیا گیا تھا، یہاں تک فرمایا گیا کہ "یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو" اور یہ کہ "جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں"۔ ان شدید احکام کی بنا پر وہ لوگ جن کی تربیت میں یتیم بچے تھے اس قدر خوف زدہ ہو گئے تھے کہ انھوں نے ان کا کھانا پینا تک اپنے سے الگ کر دیا تھا اور اس احتیاط پر بھی انھیں ڈر تھا کہ کہیں یتیموں کے مال کا کوئی حصہ ان کے مال میں نہ مل جائے۔ اسی لیے انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ان بچوں کے ساتھ ہمارے معاملہ کی صحیح صورت کیا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] اوپر جو حکم دیا گیا تھا، اِس آیت میں اس کی علت و مصلحت بیان کر دی گئی ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان نکاح کا تعلق محض ایک شہوانی تعلق نہیں ہے بلکہ ایک گہرا تمدنی، اخلاقی اور قلبی تعلق ہے۔ مومن اور مشرک کے درمیان اگر یہ تعلق ہو تو جہاں اس امر کا امکان ہے کہ مومن شوہر یا بیوی کے اثر سے مشرک شوہر یا بیوی پر اور اس کے خاندان اور آئندہ نسل پر اسلام کے عقائد اور طرز زندگی کا نقش ثبت ہوگا، وہیں اس امر کا بھی امکان ہے کہ (باقی صفحہ آئندہ پر)

نصیحت قبول کریں۔ ع۲۷

پوچھتے ہیں حیض کا کیا حکم ہے ؟ کہو، وہ ایک بیماری کی حالت ہے، اُس میں عورتوں سے الگ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہو جائیں[سلہ]۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو اُن کے پاس جاؤ اُس طرح جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے[ٹلہ]، اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی پسند کریں۔ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں، تمھیں اختیار ہے جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ[ٹکہ]، مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو[ٹلہ] اور اللہ کی ناراضی سے بچو،

(بقیہ سابق) مشرک شوہر یا بیوی کے خیالات اور طور طریقوں سے نہ صرف مومن شوہر یا بیوی بلکہ اس کا خاندان اور دونوں کی نسل تک متاثر ہو جائے گی۔ اور غالب امکان اس امر کا ہے کہ ایسے ازدواج سے اسلام اور کفر و شرک کی ایسی ایک معجونِ مرکب اُس گھر اور اس خاندان میں پرورش پائے گی جس کو غیر مسلم خواہ کتنا ہی پسند کریں مگر اسلام کسی طرح پسند کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جو شخص صحیح معنوں میں مومن ہو وہ محض اپنے جذباتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کبھی یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ اس کے گھر اور اس کے خاندان میں کافرانہ و مشرکانہ خیالات اور طور طریقے پرورش پائیں اور وہ خود بھی نادانستہ اپنی زندگی کے کسی پہلو میں کفر و شرک سے متاثر ہو جائے۔ اگر بالفرض ایک فردِ مومن کسی فردِ مشرک کے عشق میں بھی مبتلا ہو جائے تب بھی اُس کے ایمان کا اقتضا یہی ہے کہ وہ اپنے خاندان، اپنی نسل اور خود اپنے دین و اخلاق پر اپنے شخصی جذبات قربان کر دے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [سلہ] قرآن مجید اس قسم کے معاملات کو استعاروں اور کنایوں میں بیان کرتا ہے، اس لیے اس نے "الگ رہو اور قریب نہ جاؤ" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حائضہ عورت کے ساتھ ایک فرش پر بیٹھنے یا ایک جگہ کھانا کھانے سے بھی احتراز کیا جائے اور اسے بالکل اچھوت بنا کر رکھ دیا جائے، جیسا کہ یہود اور ہنود اور بعض دوسری قوموں کا دستور ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی جو توضیح فرما دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں صرف فعلِ زن و شو سے پرہیز کرنا چاہیے، باقی تمام تعلقات بدستور برقرار رکھے جائیں۔

[ٹلہ] حکم سے مراد حکمِ فطری ہے جو انسان و حیوان سب کی جبلت میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور جس سے ہر متنفس بالطبع واقف ہے۔ (باقی حواشی صفحہ آئندہ پر)

خوب جان لو کہ تمھیں ایک دن اُس سے ملنا ہے۔ اور اے نبی جو تمھاری ہدایت کو مان لیں انھیں فلاح و سعادت کا مژدہ سنا دو۔

اللہ کے نام کو ایسی قسمیں کھانے کے لیے استعمال نہ کرو جن سے مقصود نیکی اور تقویٰ اور بندگانِ خدا کی بھلائی کے کاموں سے باز رہنا ہو۔[۲۵۰] اللہ تمھاری ساری باتیں سُن رہا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ جو بے معنی قسمیں تم بلا ارادہ کھا لیا کرتے ہو ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا،[۲۵۱] مگر جو قسمیں تم سچے دل سے کھاتے ہو ان کی باز پُرس وہ ضرور کرے گا، اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بُردبار ہے۔

جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے،[۲۵۲]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۲) ۲۴۸ یعنی فطرۃ اللہ نے عورتوں کو مردوں کے لیے سیرگاہ نہیں بنایا ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان کھیت اور کسان کا سا تعلق ہے۔ کھیت میں کسان محض تفریح کے لیے نہیں جاتا بلکہ اس لیے جاتا ہے کہ اس سے پیداوار حاصل کرے۔ نسلِ انسانی کے کسان کو بھی انسانیت کی اس کھیتی میں اس لیے جانا چاہیے کہ وہ اس سے نسل کی پیداوار حاصل کرے۔ خدا کی شریعت کو اس سے بحث نہیں کہ تم اس کھیت میں کاشت کس طرح کرتے ہو، البتہ اس کا مطالبہ تم سے یہ ہے کہ جاؤ کھیت ہی میں، اور اس غرض کے لیے جاؤ کہ اس سے پیداوار حاصل کرنی ہے۔

۲۴۹ جامع الفاظ ہیں جن سے دو مطلب نکلتے ہیں اور دونوں کی یکساں اہمیت ہے۔ ایک یہ کہ اپنی نسل برقرار رکھنے کی کوشش کرو تاکہ تمھارے دنیا چھوڑنے سے پہلے تمھاری جگہ دوسرے کام کرنے والے پیدا ہوں۔ دوسرے یہ کہ جس آنے والی نسل کو تم اپنی جگہ چھوڑنے والے ہو اس کو دین، اخلاق اور آدمیت کے جوہروں سے آراستہ کرنے کی کوشش کرو۔ بعد کے فقرہ میں اس بات پر بھی تنبیہ فرما دی ہے کہ اگر ان دونوں فرائض کے ادا کرنے میں تم نے قصداً کوتاہی کی تو اللہ تم سے باز پرس کرے گا۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۲۵۰ احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے کسی بات کی قسم کھائی ہو اور بعد میں اس پر واضح ہو جائے کہ اس قسم کے توڑ دینے ہی میں خیر اور بھلائی ہے اسے قسم توڑ دینی چاہیے اور کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ قسم توڑنے کا کفارہ آگے چل کر قرآن میں بیان ہوا ہے۔

۲۵۱ یعنی بطور تکیہ کلام کے بلا ارادہ جو قسمیں زبان سے نکل جاتی ہیں، ایسی قسموں پر نہ کفارہ ہے (باقی صفحہ آئندہ پر)

اگر انھوں نے رجوع کر لیا تو اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے[۵۲]۔ اور اگر انھوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو[۵۳] تو جانے رہیں کہ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے[۵۴]۔

(بقیہ صفحہ سابق) اور نہ اُن کا مواخذہ ہوگا۔

[۵۱] اصطلاحِ شرع میں اس کو ایلا، کہتے ہیں۔ میاں اور بیوی کے درمیان تعلقات ہمیشہ خوش گوار تو نہیں رہ سکتے۔ بگاڑ کے اسباب پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں، لیکن ایسے بگاڑ کو خدا کی شریعت پسند نہیں کرتی کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ قانونی طور پر رشتۂ ازدواج میں تو بندھے رہیں مگر عملاً ایک دوسرے سے اس طرح الگ رہیں کہ گویا وہ میاں اور بیوی نہیں ہیں۔ ایسے بگاڑ کے لیے اللہ تعالیٰ نے چار مہینے کی مدت مقرر کر دی کہ یا تو اس دوران میں اپنے تعلقات درست کر لو، ورنہ ازدواج کا رشتہ منقطع کر دو تاکہ دونوں ایک دوسرے سے آزاد ہو کر جس سے نباہ کر سکیں اس کے ساتھ نکاح کر لیں۔

آیت میں چونکہ "قسم کھا لینے" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس لیے فقہائے حنفیہ اور شافعیہ نے اس آیت کا منشا یہ سمجھا ہے کہ جہاں شوہر نے بیوی سے تعلق زن و شو نہ رکھنے کی قسم کھائی ہو صرف وہیں اس حکم کا اطلاق ہوگا، باقی رہا قسم کھائے بغیر تعلق منقطع کر لینا، تو یہ خواہ کتنی ہی طویل مدت کے لیے ہو، اس آیت کا حکم اُس صورت پر چسپاں نہ ہوگا۔ مگر فقہائے مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ خواہ قسم کھائی گئی ہو یا نہ کھائی گئی ہو، دونوں صورتوں میں ترکِ تعلق کے لیے یہی چار مہینے کی مدت ہے، اور ایک قول امام احمد کا بھی اسی کی تائید میں ہے۔

حضرت علی اور ابن عباس کی رائے میں یہ حکم صرف اُس ترکِ تعلق کے لیے ہے جو بگاڑ کی وجہ سے ہو، رہا کسی مصلحت سے شوہر کا بیوی کے ساتھ جسمانی رابطہ منقطع کر دینا جبکہ تعلقات خوشگوار ہوں، تو اس پر یہ حکم منطبق نہیں ہوتا۔ لیکن دوسرے فقہاء کی رائے میں ہر وہ حلف جو شوہر اور بیوی کے درمیان رابطۂ جسمانی کو منقطع کر دے، ایلاء ہے اور اُسے چار مہینے سے زیادہ قائم نہ رہنا چاہیے، خواہ ناراضی سے ہو یا رضامندی سے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۲] بعض فقہاء نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ اگر وہ اس مدت کے اندر اپنی قسم توڑ دیں اور پھر سے تعلق زن و شو قائم کر لیں تو ان پر قسم توڑنے کا کفارہ نہیں ہے، اللہ ویسے ہی معاف کر دے گا۔ لیکن اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ انھیں قسم توڑنے کا کفارہ دینا ہوگا۔ غفور و رحیم کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کفارہ سے تمہیں معاف کر دیا گیا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمہارے کفارے کو قبول کرے گا اور ترکِ تعلق کے دوران میں جو زیادتی دونوں نے ایک دوسرے پر کی ہو اسے معاف کر دیا جائے گا۔

[۵۳] حضرت عثمان، ابن مسعود، زید بن ثابت وغیرہم کے نزدیک رجوع کا موقع چار مہینے کے اندر ہی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو وہ تین مرتبہ ایامِ ماہواری آنے تک اپنے آپ کو روکے رکھیں اور اُن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ نے اُن کے رحم میں جو کچھ خلق فرمایا ہو اُسے چھپائیں۔ انھیں ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیے اگر وہ اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتی ہیں۔ اُن کے شوہر تعلقات درست کر لینے پر آمادہ ہوں تو وہ اِس عدت کے دوران میں انھیں پھر اپنی زوجیت میں واپس لے لینے کے حق دار ہیں[۱]۔

(حواشی صفحہ سابق) اس مدت کا گذر جانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ شوہر نے طلاق کا عزم کر لیا ہے، اس لیے مدت گذرتے ہی طلاق خود بخود واقع ہو جائے گی اور وہ ایک طلاق بائن ہو گی، یعنی دورانِ عدت میں شوہر کو رجوع کا حق نہ ہو گا البتہ اگر وہ دونوں چاہیں تو دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔ حضرات عمر، علی، ابنِ عباس اور ابنِ عمر سے بھی ایک قول اسی معنی میں منقول ہے اور فقہاء حنفیہ نے اسی رائے کو قبول کیا ہے۔ سعید ابن مسیب، مکحول، زہری وغیرہ حضرات اس رائے سے یہاں تک تو متفق ہیں کہ چار مہینہ کی مدت گذرنے کے بعد خود بخود طلاق واقع ہو جائے گی، مگر اُن کے نزدیک وہ ایک طلاق رجعی ہو گی، یعنی دورانِ عدت میں شوہر کو رجوع کر لینے کا حق ہو گا اور رجوع نہ کرے تو عدت گذر جانے کے بعد دونوں اگر چاہیں تو نکاح کر سکیں گے۔ بخلاف اس کے حضرت عائشہ، ابوالدرداء اور اکثر فقہاء مدینہ کی رائے یہ ہے کہ چار مہینہ کی مدت گذرنے کے بعد معاملہ عدالت میں پیش ہو گا اور حاکمِ عدالت شوہر کو حکم دے گا کہ یا تو اس عورت سے رجوع کرو یا اُسے طلاق دو۔ حضرت عمر، حضرت علی اور ابنِ عمر کا ایک قول اس کی تائید میں بھی ہے اور امام مالک و شافعی نے اسی کو قبول کیا ہے۔

[۲] یعنی اگر تم نے بیوی کو ناروا بات پر چھوڑا ہے تو اللہ سے بے خوف نہ رہو، وہ تمہاری زیادتی سے واقف ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [۱] اصل میں لفظ "قُرْء" استعمال ہوا ہے جس کے مفہوم میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک جماعت کے نزدیک قرء سے مراد حیض ہے اور اس رائے کے بموجب جب تک عورت تیسرے حیض سے فارغ ہو کر نہا نہ لے اس وقت تک طلاق بائن نہ ہو گی اور شوہر کو رجوع کا حق باقی رہے گا۔ حضرت ابوبکر، عمر، علی، ابنِ عباس، ابوموسیٰ اشعری، ابنِ مسعود اور بڑے بڑے صحابہ کی یہی رائے ہے اور فقہائے حنفیہ نے اسی کو قبول کیا ہے۔ بخلاف اس کے دوسری جماعت کہتی ہے کہ عورت کو تیسری بار حیض آتے ہی شوہر کا حقِ رجوع ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ رائے حضرت عائشہ، ابنِ عمر، اور زید ابنِ ثابت کی ہے۔
(باقی صفحۂ آئندہ پر)

عورتوں کے لیے بھی معروف طریقہ پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق اُن پر ہیں، البتہ مردوں کو اُن پر ایک درجہ حاصل ہے، اور سب پر اللہ غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے۔

طلاق دو بار ہے، پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا نہیں تو بھلے طریقہ سے رخصت کر دیا جائے[۵] ۔۔۔ اور رخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا تمھارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انھیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لے لو، البتہ وہ صورت مستثنیٰ ہے کہ زوجین کو اللہ کے حدود قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورت میں اگر تمھیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حدودِ الٰہی پر قائم نہ رہیں گے تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے[۶]۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، اِن سے تجاوز نہ کرو، اور جو لوگ حدودِ الٰہی سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں ۔۔۔ پھر اگر (دو بار طلاق دینے کے بعد شوہر نے عورت کو رخصت کرنے ہی کا فیصلہ کیا اور تیسری بار) طلاق دے دی تو وہ عورت پھر اس کے لیے حلال نہ ہوگی، اِلّا یہ کہ

(بقیہ صفحہ سابق) مگر واضح رہے کہ یہ حکم صرف اس صورت سے متعلق ہے جس میں شوہر نے عورت کو ایک یا دو طلاقیں دی ہوں۔ تین طلاقیں دینے کی صورت میں شوہر کو حقِ رجوع نہیں ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵] طلاق کا صحیح طریقہ جو قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ عورت کو طُہر کی حالت میں ایک بار طلاق دی جائے، پھر دوسرے طہر میں اگر چاہے تو ایک اور طلاق دے دے۔ اس صورت میں شوہر کو حق رہتا ہے کہ عدت ختم ہونے سے پہلے جب چاہے رجوع کر لے، اور اگر عدت گزر بھی جائے تو دونوں کے لیے موقع باقی رہتا ہے کہ پھر باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر لیں۔ لیکن تیسرے طُہر میں تیسری بار طلاق دینے کے بعد نہ تو شوہر کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے اور نہ اس کا ہی کوئی موقع رہتا ہے کہ دونوں کا پھر نکاح ہو سکے۔ رہی یہ صورت کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دی جائیں، تو یہ سخت گناہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی مذمت فرمائی ہے، اور حضرت عمرؓ سے یہاں تک ثابت ہے کہ جو شخص ایک وقت اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا تھا آپ اس کو دُرّے لگاتے تھے۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۲۳۷ پر)

اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو اور وہ اسے طلاق دیدے ؏، تب اگر پہلا شوہر اور یہ عورت دونوں یہ خیال کریں کہ حدود الٰہی پر قائم رہیں گے تو ان کے لیے ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں جنھیں وہ ان لوگوں کی ہدایت کے لیے واضح کر رہا ہے جو (اس کی حدوں کو توڑنے کا انجام) جانتے ہیں۔

جب تم عورتوں کو طلاق دیدو اور ان کی عدت پوری ہونے کو آجائے تو یا بھلے طریقہ سے انھیں روک لو یا بھلے طریقہ سے رخصت کردو۔ محض ستانے کی خاطر انھیں نہ روکنا کہ یہ زیادتی ہوگی اور جو ایسا کرے گا وہ درحقیقت آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرے گا۔ ؏ اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ۔ بھول نہ جاؤ کہ اللہ نے کس نعمتِ عظمیٰ سے تمھیں سرفراز کیا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ جو کتاب اور حکمت اُس نے تم پر نازل کی ہے اس کا احترام ملحوظ رکھو۔ ؏ اللہ سے ڈرو اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے۔ ۲۷۹

جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو پھر اس میں مانع

(بقیہ صفحہ سابق) ؏ اسی چیز کا نام خلع ہے، یعنی اگر عورت طلاق لینے کی خواہشمند ہو تو وہ شوہر کو کچھ دے کر طلاق حاصل کرلے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ؏ احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض اپنی مطلقہ بیوی کو اپنے لیے حلال کرنے کی خاطر کسی سے سازش کے طور پر اُس کا نکاح کرائے اور پہلے سے یہ طے کرلے کہ وہ نکاح کے بعد اُسے طلاق دیدے گا، تو یہ سراسر ایک ناجائز فعل ہے۔ ایسا نکاح، نکاح نہ ہوگا بلکہ محض ایک بدکاری ہوگی، اور ایسے سازشی نکاح و طلاق سے عورت ہرگز اپنے سابق شوہر کے لیے حلال نہ ہوگی۔ لوگ پہلے تو اپنی حماقت سے بیک وقت تین طلاقیں دے بیٹھتے ہیں، پھر اس پر پچھتاتے ہیں اور سازشی طریقہ سے حلالہ کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ دراصل گناہ در گناہ ہے۔

؏ یعنی ایسا کرنا درست نہیں ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دے اور عدت گذرنے سے پہلے محض اس لیے رجوع کرلے کہ اسے پھر ستانے اور دق کرنے کا موقع ہاتھ آجائے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت فرماتا ہے کہ رجوع کرتے ہو تو اس نیت سے کرو کہ اب حسن سلوک سے رہنا ہے، ورنہ بہتر یہ ہے کہ شریفانہ طریقہ سے رخصت کردو۔

؏ یعنی اس حقیقت کو فراموش نہ کرو کہ اللہ نے تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیکر دنیا کی رہنمائی (باقی صفحہ آئندہ پر)

نہ ہو کہ وہ اپنے زیرِ تجویز شوہروں سے نکاح کرلیں جب کہ وہ معروف طریقہ سے باہم مناکحت پر راضی ہوں[۱]۔ تمہیں نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا اگر تم اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لانے والے ہو۔ تمہارے لیے شائستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے کہ اس سے باز رہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔

جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدت رضاعت تک دودھ پیے تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں[۲]۔ اس صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقہ سے انھیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔ مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہیے۔ نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا ہے اور نہ باپ ہی کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے — دودھ پلانے والی کا یہ حق جیسا بچے کے باپ پر ہے ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے[۳] — لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اگر تمہارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دودھ پلوانے کا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کا جو کچھ معاوضہ طے کرو وہ معروف طریقہ پر ادا کردو۔ اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔

(بقیہ صفحہ سابق) کے عظیم الشان منصب پر مامور کیا ہے۔ تم امت وسط بنائے گئے ہو تمہیں نیکی اور راستی کا گواہ بنا کر کھڑا کیا گیا ہے۔ تمہارا یہ کام نہیں ہے کہ حیلہ بازیوں سے آیاتِ الٰہی کا کھیل بناؤ، قانون کے الفاظ سے روحِ قانون کے خلاف ناجائز فائدے اٹھاؤ، اور دنیا کو راہِ راست دکھانے کے بجائے خود اپنے گھروں میں ظالم اور بدراہ بن کر رہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی اگر کسی عورت کو اس کے شوہر نے طلاق دیدی ہو اور زمانۂ عدت کے اندر اس سے رجوع نہ کیا ہو، پھر وہ دونوں آپس میں دوبارہ نکاح کرنے کے لیے راضی ہوں تو عورت کے رشتہ داروں کو اس میں مانع نہ ہونا چاہیے۔ نیز اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہو اور عورت اس سے آزاد ہو کر کہیں دوسری جگہ اپنا نکاح کرنا چاہتی ہو تو اس سابق شوہر کو ایسی کمینہ حرکت نہ کرنی چاہیے کہ اس کے نکاح میں مانع ہو اور یہ کوشش کرتا پھرے کہ جس عورت کو اس نے چھوڑا ہے اُسے کوئی نکاح میں لانا قبول نہ کرے۔

[۲] یہ اس صورت کا حکم ہے جبکہ زوجین ایک دوسرے سے علیحدہ ہوچکے ہوں (خواہ طلاق کے ذریعہ سے یا خلع یا فسخ

(باقی صفحہ آئندہ پر)

تم میں سے جو لوگ مر جائیں اُن کے پیچھے اگر اُن کی بیویاں زندہ ہوں تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روکے رکھیں[۲۵۱]۔ پھر جب اُن کی عدت پوری ہو جائے تو انھیں اختیار ہے اپنی ذات کے معاملہ میں معروف طریقے سے جو چاہیں کریں، تم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں، اللہ ہر ایک کے اعمال سے باخبر ہے۔ زمانہ عدت میں خواہ تم اُن بیوہ عورتوں کے ساتھ منگنی کا ارادہ اشارہ کنایہ میں ظاہر کر دو، خواہ دل ہی میں چھپائے رکھو، دونوں صورتوں میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ اُن کا خیال تو تمھارے دل میں آئے گا ہی، مگر دیکھو! خفیہ عہد و پیمان نہ کرنا، اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف طریقے سے کرو۔ اور عقدِ نکاح باندھنے کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تمھارے دلوں کا حال تک جانتا ہے لہٰذا اس سے ڈرو، اور یہ بھی جان لو

ع۳۰ کہ اللہ بردبار ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں سے درگذر فرماتا ہے۔

تم پر کچھ گناہ نہیں اگر اپنی عورتوں کو طلاق دیدو قبل اس کے کہ ہاتھ لگانے کی نوبت آئے یا مہر مقرر ہو۔ اس صورت میں انھیں کچھ نہ کچھ دینا ضرور چاہیے[۲۵۲]۔ خوش حال آدمی اپنی مقدرت کے مطابق اور غریب اپنی مقدرت کے مطابق معروف طریقہ سے دے۔ یہ حق ہے نیک آدمیوں پر۔ اور اگر تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دی ہو لیکن مہر مقرر کیا جا چکا ہو تو اس صورت میں نصف مہر دینا ہوگا، یہ اور

(بقیہ صفحہ سابق) وتفریق کے ذریعہ سے) اور عورت کی گود میں دودھ پیتا بچہ ہو۔

۲۵۰ یعنی اگر باپ مر جائے تو جو اس کی جگہ بچہ کا ولی ہو اُسے بھی یہ حق اسی طرح ادا کرنا چاہیے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۲۵۱ یہ عدتِ وفات اُن عورتوں کے لیے بھی ہے جن سے شوہروں کی خلوتِ صحیحہ نہ ہوئی ہو۔ البتہ حاملہ عورت اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس کی عدتِ وفات وضعِ حمل تک ہے خواہ وضعِ حمل شوہر کی وفات کے بعد ہی ہو جائے یا اس میں کئی مہینے صرف ہوں۔

۲۵۲ اس طرح رشتہ جوڑنے کے بعد توڑ دینے سے بہر حال عورت کو کچھ نہ کچھ نقصان تو پہنچتا ہی ہے، اس لیے اللہ نے حکم دیا کہ حسبِ مقدرت اس کی تلافی کرو۔

بات ہے کہ عورت نرمی برتے (اور مہر نہ لے) یا وہ مرد جس کے اختیار میں عقدِ نکاح ہے نرمی سے کام لے (اور پورا مہر دیدے)، اور تم (یعنی مرد) نرمی سے کام لو تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو۔[۱] تمہارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے۔

اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو،[۲] خصوصاً ایسی نماز کی جو محاسنِ صلوٰۃ کی جامع ہو۔[۳] اللہ کے آگے اس طرح کھڑے ہو جیسے فرماں بردار غلام کھڑے ہوتے ہیں۔ بدامنی کی حالت ہو تو خواہ پیدل ہو خواہ سوار،

---

[۱] یعنی انسانی تعلقات کی بہتری و خوشگواری کے لیے لوگوں کا باہم فیاضانہ برتاؤ کرنا ضروری ہے۔ اگر ہر ایک شخص ٹھیک ٹھیک اپنے قانونی حق ہی پر اڑا رہے تو اجتماعی زندگی کبھی خوش گوار نہیں ہو سکتی۔

[۲] قوانینِ تمدن و معاشرت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اس تقریر کو نماز کی تاکید پر ختم فرماتا ہے کیونکہ نماز ہی وہ چیز ہے جو انسان کے اندر خدا کا خوف، نیکی و پاکیزگی کے جذبات اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کا مادّہ پیدا کرتی ہے اور اسے راستی پر قائم رکھتی ہے۔ یہ چیز نہ ہو تو انسان کبھی الٰہی قوانین کی پابندی پر ثابت قدم نہیں رہ سکتا اور آخر کار اسی نافرمانی کی رَو میں بہہ نکلتا ہے جس پر یہودی بہہ نکلے۔

[۳] اصل میں لفظ "صلوٰۃ وسطیٰ" استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد بعض مفسرین نے صبح کی نماز لی ہے، بعض نے ظہر، بعض نے مغرب اور بعض نے عشاء، لیکن ان میں سے کوئی قول بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے۔ صرف اہلِ تاویل کا استنباط ہے۔ سب سے زیادہ اقوال نمازِ عصر کے حق میں ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی نماز کو صلوٰۃ وسطیٰ قرار دیا ہے۔ لیکن جس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جنگِ احزاب کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کے حملہ نے اس درجہ مشغول رکھا کہ سورج ڈوبنے کو آگیا اور آپ نمازِ عصر نہ پڑھ سکے۔ اُس وقت آپ نے فرمایا کہ خدا ان لوگوں کی قبریں اور اِن کے گھر آگ سے بھر دے، اِنھوں نے ہماری صلوٰۃ وسطیٰ فوت کرا دی۔ اس سے یہ سمجھا گیا کہ آپ نے نمازِ عصر کو صلوٰۃ وسطیٰ فرمایا ہے۔ حالانکہ اس کا یہ مطلب زیادہ قرینِ صواب ہے کہ اس مشغولیت نے اعلیٰ درجہ کی نماز ہم سے فوت کرا دی، نماو قت پر بھی پڑھنی پڑے گی، جلدی جلدی ادا کرنی ہوگی، خشوع و خضوع اور اطمینان و سکون کے ساتھ نہ پڑھ سکیں گے۔

وسطیٰ کے معنی بیچ والی چیز کے بھی ہیں اور ایسی چیز کے بھی جو اعلیٰ اور اشرف ہو۔ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد بیچ کی نماز بھی ہو سکتی ہے، اور ایسی نماز بھی جو صحیح وقت پر پورے خشوع اور توجہ الی اللہ کی ساتھ پڑھی جائے، اور جس میں نماز کی تمام خوبیاں موجود ہوں۔ بعد کا فقرہ کہ اللہ کے آگے فرمانبردار بندوں کی طرح کھڑے ہو خود اس کی تفسیر کر رہا ہے۔

جس طرح ممکن ہو نماز پڑھو۔ اور جب امن میسر آجائے تو اللہ کو اُس طریقہ سے یاد کرو جو اُس نے تمہیں سکھا دیا ہے جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔

تم میں سے[1] جو لوگ وفات پائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑ رہے ہوں ان کو چاہیے کہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک ان کو نان و نفقہ دیا جائے اور وہ گھر سے نہ نکالی جائیں۔ پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو اپنی ذات کے معاملہ میں معروف طریقہ سے وہ جو کچھ بھی کریں اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، اللہ سب پر غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ اسی طرح جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو انھیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے، یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔
اس طرح اللہ اپنے احکام تمہیں صاف صاف بتاتا ہے۔ اُمید ہے کہ تم سمجھ بوجھ کر کام کرو گے۔ ۳۱ع

تم نے[2] ان لوگوں کے حال پر بھی کچھ غور کیا جو موت کے ڈر سے اپنے گھر بار چھوڑ کر نکلے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں تھے؟ اللہ نے اُن سے فرمایا مر جاؤ۔ پھر اُس نے ان کو دوبارہ زندگی بخشی۔[3]

---

[1] سلسلہ تقریر اوپر ختم ہو چکا تھا، یہ کلام اس کے تتمہ اور ضمیمہ کے طور پر ہے۔

[2] یہاں سے ایک دوسرا سلسلۂ تقریر شروع ہوتا ہے جس میں مسلمانوں کو راہِ خدا میں جہاد اور مالی قربانیاں کرنے پر اُبھارا گیا ہے اور انھیں ان کمزوریوں سے بچنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے جن کی وجہ سے آخر کار بنی اسرائیل زوال و انحطاط سے دوچار ہوئے۔ اس مقام کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ مسلمان اُس وقت مکہ سے نکالے جا چکے تھے، سال ڈیڑھ سال سے مدینہ میں پناہ گزیں تھے، اور کفار کے مظالم سے تنگ آکر خود بار بار مطالبہ کر چکے تھے کہ ہمیں لڑنے کی اجازت دی جائے۔ مگر جب انھیں لڑائی کا حکم دیدیا گیا تو اب ان میں سے بعض لوگ کسمسا رہے تھے جیسا کہ چھبیسویں رکوع کے آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ اس لیے یہاں بنی اسرائیل کی تاریخ کے دو اہم واقعات سے انھیں عبرت دلائی گئی ہے۔

[3] یہ اشارہ بنی اسرائیل کے واقعۂ خروج کی طرف ہے۔ سورۂ مائدہ کے چوتھے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں مصر سے نکلے تھے۔ دشت و بیاباں میں بے خانماں پھر رہے تھے۔ خود ایک ٹھکانے کے لیے بے تاب تھے۔ مگر جب اللہ کے ایما سے حضرت موسیٰ نے ان کو حکم دیا کہ کنعانی ظالموں کو ارض

(باقی اگلے صفحہ پر)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ انسان پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ مسلمانو! اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور خوب جان رکھو کہ اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔ تم میں کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسن دے[1] تاکہ اللہ اُسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے؟ گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی، اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔

پھر تم نے اُس معاملہ پر بھی غور کیا جو موسیٰ کے بعد سردارانِ بنی اسرائیل کو پیش آیا تھا؟ انھوں نے اپنے نبی سے کہا ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں[2]۔ نبی نے پوچھا

(بقیہ صفحہ سابق) فلسطین سے نکال دو اور اس علاقہ کو فتح کر لو تو انھوں نے بزدلی دکھائی اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے انھیں چالیس سال تک زمین میں سرگرداں پھرنے کے لیے چھوڑ دیا یہاں تک کہ جب ایک نسل ختم ہو گئی اور دوسری نسل صحراؤں کی گود میں پل کر اٹھی تب اللہ تعالیٰ نے انھیں کنعانیوں پر غلبہ عطا کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی معاملہ کو موت اور دوبارہ زندگی کے الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] "قرضِ حسن"، لفظی ترجمہ "اچھا قرض"۔ یعنی ایسا قرض جو خالص نیکی کے جذبہ سے بے غرضانہ کسی کو دیا جائے۔ اللہ کی راہ میں جو مال خرچ کیا جائے، اللہ اس کو اپنے ذمہ قرض قرار دیتا ہے اور یہ وعدہ کرتا ہے کہ میں نہ صرف اصل ادا کروں گا بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ دوں گا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ وہ ہو قرضِ حسن، یعنی اپنی کسی نفسانی غرض کے لیے نہ دیا جائے بلکہ محض اللہ کی خاطر اُن کاموں میں صرف کیا جائے جن کو وہ پسند کرتا ہے۔

[2] یہ تقریباً ایک ہزار برس قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ اُس وقت بنی اسرائیل پر عمالقہ چیرہ دست ہو گئے تھے اور انھوں نے اسرائیلیوں سے اکثر علاقے چھین لیے تھے۔ سموئیل نبی اُس زمانہ میں بنی اسرائیل کے درمیان حکومت کرتے تھے مگر وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے اس لیے سردارانِ بنی اسرائیل نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کوئی اور شخص ان کا سردار ہو جس کی قیادت میں وہ جنگ کر سکیں۔ لیکن اس وقت بنی اسرائیل میں اس قدر جاہلیت آچکی تھی اور وہ غیر مسلم قوموں کے طور طریقوں سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ خلافت اور بادشاہی کا فرق اُن کے ذہنوں سے نکل گیا تھا۔ اس لیے انھوں نے درخواست جو کی وہ خلیفہ کے تقرر کی نہیں بلکہ ایک بادشاہ کے تقرر کی تھی۔ اس سلسلہ میں بائیبل کی کتاب سموئیل اول میں جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۲) "سموئیل زندگی بھر اسرائیلیوں کی عدالت کرتا رہا . . . . تب سب اسرائیلی بزرگ جمع ہو کر رامہ میں سموئیل کے پاس آئے اور اس سے کہنے لگے کہ دیکھ تو ضعیف ہے اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے۔ اب تو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر دے جو اور قوموں کی طرح ہماری عدالت کرے . . . . یہ بات سموئیل کو بُری لگی اور سموئیل نے خداوند سے دعا کی اور خداوند نے سموئیل سے کہا کہ جو کچھ یہ لوگ تجھ سے کہتے ہیں تو اس کو مان کیونکہ انھوں نے تیری نہیں بلکہ میری حقارت کی ہے کہ میں اُن کا بادشاہ نہ رہوں . . . . اور سموئیل نے ان لوگوں کو جو اس سے بادشاہ کے طالب تھے خداوند کی سب باتیں کہہ سنائیں اور اس نے کہا کہ جو بادشاہ تم پر سلطنت کریگا اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ تمہارے بیٹوں کو لے کر اپنے رتھوں کے لیے اور اپنے رسالہ میں نوکر رکھے گا اور وہ اس کے رتھوں کے آگے دوڑیں گے اور وہ ان کو ہزار ہزار کے سردار اور پچاس پچاس کے جمعدار بنائے گا اور بعض سے ہل جتوائے گا اور فصل کٹوائے گا اور اپنے لیے جنگ کے ہتھیار اور رتھوں کے ساز بنوائے گا اور تمہاری بیٹیوں کو گندھن اور باورچن اور نان پز بنائے گا اور تمہارے کھیتوں اور تاکستانوں اور زیتون کے باغوں کو جو اچھے سے اچھے ہوں گے لے کر اپنے خدمتگاروں کو عطا کرے گا اور تمہارے کھیتوں اور تاکستانوں کا دسواں حصہ لے کر اپنے خوجوں اور خادموں کو دے گا اور تمہارے نوکر چاکروں اور لونڈیوں اور تمہارے شکیل جوانوں اور تمہارے گدھوں کو لے کر اپنے کام پر لگائے گا اور وہ تمہاری بھیڑ بکریوں کا بھی دسواں حصہ لے گا۔ سو تم اس کے غلام بن جاؤ گے اور تم اس دن اس بادشاہ کے سبب سے جسے تم نے اپنے لیے چنا ہوگا فریاد کرو گے پر اس دن خداوند تم کو جواب نہ دے گا۔ تو بھی لوگوں نے سموئیل کی بات نہ سنی اور کہنے لگے نہیں ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر ہو تاکہ ہم بھی اور قوموں کے مانند ہوں اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہماری طرف سے لڑائی کرے . . . . خداوند نے سموئیل کو فرمایا تو اُن کی بات مان لے اور اُن کے لیے ایک بادشاہ مقرر کر۔"

(باب ۷، آیت ۱۵ تا باب ۸ آیت ۲۲)

"پھر سموئیل لوگوں سے کہنے لگا . . . . جب تم نے دیکھا کہ بنی عمون کا بادشاہ ناحس تم پر چڑھ آیا تو تم نے مجھ سے کہا کہ ہم پر کوئی بادشاہ سلطنت کرے حالانکہ خداوند تمہارا خدا تمہارا بادشاہ تھا۔ سو اب اس بادشاہ کو دیکھو جسے تم نے چن لیا اور جس کے لیے تم نے درخواست کی تھی۔ دیکھو خداوند نے تم پر بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔ اگر تم خداوند سے ڈرتے اور اس کی پرستش کرتے اور اس کی بات مانتے رہو اور خداوند کے حکم سے سرکشی نہ کرو اور تم

(باقی اگلے صفحہ پر)

کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ تم کو لڑائی کا حکم دیا جائے اور پھر تم نہ لڑو ؟ وہ کہنے لگے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہِ خدا میں نہ لڑیں جبکہ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور ہمارے بال بچے ہم سے جدا کر دیے گئے ہیں۔ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا تو ایک قلیل تعداد کے سوا وہ سب پیٹھ موڑ گئے، اور اللہ ان میں سے ایک ایک ظالم کو جانتا ہے۔

ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوتؑ کو تمھارے لیے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بولے "ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلہ میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے"۔ نبی نے جواب دیا "اللہ نے تمھارے مقابلہ میں اسی کو منتخب کیا ہے اور اس کو دماغی و جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں، اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے، اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے"۔ اس کے ساتھ اُن کے نبی نے ان کو یہ بھی بتایا کہ "خدا کی طرف سے اس کے بادشاہ مقرر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے عہد میں وہ صندوق تمھیں واپس مل جائے گا جس میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے، جس میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں، اور

(بقیہ صفحہ سابق) اور وہ بادشاہ بھی جو تم پر سلطنت کرتا ہے خداوند اپنے خدا کے پیرو بنے رہو تو خیر، پر اگر تم خداوند کی بات نہ مانو بلکہ خداوند کے حکم سے سرکشی کرو تو خداوند کا ہاتھ تمھارے خلاف ہوگا جیسے وہ تمھارے باپ دادا کے خلاف ہوتا تھا ..... اور تم جان لوگے اور دیکھ بھی لوگے کہ تم نے خداوند کے حضور اپنے لیے بادشاہ مانگنے سے کتنی بڑی شرارت کی ..... اب رہا میں سو خدا نہ کرے کہ تمھارے لیے دعا کرنے سے باز آکر خداوند کا گنہگار ٹھیروں، بلکہ میں وہی راہ جو اچھی اور سیدھی ہے تم کو بتاؤں گا" (باب ۱۲۔ آیت ۱۲ تا ۲۳)

کتاب سموئیل کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بادشاہت کے قیام کا یہ مطالبہ اللہ اور اس کے نبی کو پسند نہ تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ قرآن مجید میں اِس مقام پر سردارانِ بنی اسرائیل کے اس مطالبہ کی مذمت کیوں نہیں کی گئی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اس قصہ کا ذکر جس غرض کے لیے کیا ہے اس سے یہ مسئلہ غیر متعلق ہے کہ ان کا مطالبہ صحیح تھا یا نہ تھا۔ یہاں تو یہ بتانا مقصود ہے کہ بنی اسرائیل کس قدر بزدل ہو گئے تھے اور ان میں کس قدر نفسانیت آگئی تھی اور ان کے اندر اخلاقی انضباط کی کتنی کمی تھی جس کے سبب سے آخر کار وہ گر گئے، اور اس ذکر کی غرض یہ ہے کہ مسلمان اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنے اندر یہ کمزوریاں پرورش نہ کریں (باقی اگلے صفحہ پر)

جس کو اس وقت فرشتے سنبھالے ہوئے ہیں[۲۷۵]۔ اگر تم مومن ہو تو یہ تمہارے لیے بہت بڑی نشانی ہے"۔ ع ۳۲

پھر جب طالوت لشکر لے کر چلا تو اس نے کہا ایک دریا پر اللہ کی طرف سے تمہاری آزمائش ہونے والی ہے۔ جو اس کا پانی پیے گا وہ میرا ساتھی نہیں، میرا ساتھی صرف وہ ہے جو اس سے پیاس نہ بجھائے، ہاں ایک آدھ چلو کوئی پی لے تو پی لے۔ مگر ایک گروہِ قلیل کے سوا وہ سب اس دریا سے سیراب ہوئے[۲۷۶]۔

(بقیہ صفحہ سابق) ۲۷۳ بائیبل میں اس کا نام "ساؤل" لکھا ہے اور اس کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے کہ "بنی اسرائیل کے درمیان اس سے زیادہ خوبصورت کوئی شخص نہ تھا اور وہ ایسا قد آور تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے"۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۲۷۵ بائیبل کا بیان اس باب میں قرآن سے کسی حد تک مختلف ہے تاہم اس سے اصل واقعہ کی تفصیلات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صندوق جس میں تبرکات محفوظ تھے فلسطینی مشرکین نے ایک لڑائی کے موقع پر بنی اسرائیل سے چھین لیا تھا لیکن یہ مشرکین کے جس شہر اور جس بستی میں رکھا گیا وہاں وبائیں پھوٹ پڑیں، آخر کار انھوں نے خوف کے مارے اسے ایک بیل گاڑی پر رکھ کر گاڑی کو ہانک دیا۔ غالباً اسی معاملہ کی طرف قرآن ان الفاظ میں اشارہ کرتا ہے کہ اُس وقت وہ صندوق فرشتوں کی حفاظت میں تھا کیونکہ وہ گاڑی بغیر کسی گاڑی بان کے ہانک دی گئی تھی اور اللہ کے حکم سے یہ فرشتوں ہی کا کام تھا کہ وہ اُسے چلا کر بنی اسرائیل کی طرف لے آئے۔ رہا یہ ارشاد کہ "اس صندوق میں تمہارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے" تو بائیبل کے بیان سے اس کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل اس کو بڑا متبرک اور اپنے لیے فتح و نصرت کا نشان سمجھتے تھے۔ جب وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو پوری قوم کی ہمت ٹوٹ گئی اور ہر اسرائیلی یہ خیال کرنے لگا کہ خدا کی رحمت ہم سے پھر گئی ہے اور اب ہمارے بُرے دن آگئے ہیں۔ پس اُس صندوق کا واپس آنا اس قوم کے لیے بڑی تقویتِ قلب کا موجب تھا اور یہ ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے ان کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں پھر بندھ سکتی تھیں۔

۲۷۶ غالباً دریائے اردن مراد ہے جس کے مغرب میں فلسطین اور مشرق میں شرق اردن واقع ہے۔ بنی اسرائیل اس وقت شکست کھا کر شرق اردن کی طرف ہٹ گئے تھے۔ اب طالوت انھیں لے کر دریا کے مغربی کنارے کی طرف اترنا چاہتا تھا، مگر چونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کی قوم کے اندر اخلاقی انضباط بہت کم رہ گیا ہے اس لیے اس نے کارآمد اور ناکارہ لوگوں کو تمیز کرنے کے لیے یہ آزمائش تجویز کی۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ تھوڑی دیر کے لیے اپنی پیاس تک ضبط نہ کر سکیں (باقی صفحہ آئندہ پر)

پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی مسلمان دریا پار کر کے آگے بڑھے تو انھوں نے طالوت سے کہدیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔[۱] لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انھیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے انھوں نے کہا "بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔" اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلہ پر نکلے تو انھوں نے دعا کی "اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر، ہمارے قدم جما دے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر۔" آخر کار اللہ کے اذن سے انھوں نے کافروں کو مار بھگایا، اور داؤد[۲] نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اسے سلطنت اور حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کا چاہا اس کو علم دیا ـــ اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا،[۳] لیکن دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے (کہ وہ اس طرح دفع فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے۔

(بقیہ صفحہ سابق) ان پر کیا بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دشمن کے مقابلہ میں پامردی دکھائیں گے جس سے پہلے ہی شکست کھا چکے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یہ کہنے والے وہی تھے جنھوں نے دریا پر پہلے ہی اپنی بے صبری کا مظاہرہ کر دیا تھا۔

[۲] داؤد علیہ السلام اُس وقت ایک کم سن نوجوان تھے۔ اتفاق سے طالوت کے لشکر میں عین اس وقت پہنچے جبکہ فلسطیوں کی فوج کا گراں ڈیل پہلوان "جالوت" (جولیت) بنی اسرائیل کی فوج کو دعوت مبارزت دے رہا تھا اور اسرائیلیوں میں سے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس کے مقابلہ کو نکلے۔ حضرت داؤد یہ رنگ دیکھ کر بے محابا اس کے مقابلہ پر میدان میں جا پہنچے اور اس کو قتل کر دیا۔ اس واقعہ نے انھیں تمام اسرائیلیوں کی آنکھوں کا تارا بنا دیا، طالوت نے اپنی بیٹی ان سے بیاہ دی اور آخر کار وہی اسرائیلیوں کے فرمانروا ہوئے۔

[۳] یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کا انتظام برقرار رکھنے کے لیے یہ ضابطہ بنا رکھا ہے کہ وہ انسانوں کے مختلف گروہوں کو ایک حد خاص تک زمین میں غلبہ و طاقت حاصل کرنے دیتا ہے اور جب کوئی گروہ حد سے بڑھنے لگتا ہے تو کسی دوسرے

(باقی صفحہ آئندہ پر)

یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم ٹھیک ٹھیک تم کو سنا رہے ہیں اور تم یقیناً ان لوگوں میں سے ہو جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یہ رسول (جو ہماری طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہوئے) ہم نے ان کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مرتبے عطا کیے۔ ان میں کوئی ایسا تھا جس سے خدا خود ہمکلام ہوا، کسی کو اس نے دوسری حیثیتوں سے بلند درجے دیے، اور آخر میں عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور روحِ پاک سے اس کی مدد کی۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ ان رسولوں کے بعد، جو لوگ روشن نشانیاں دیکھ چکے تھے وہ آپس میں لڑتے، مگر (اللہ کی مشیت یہ نہ تھی، اسی لیے) لوگوں میں اختلاف ہوا کہ کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر اختیار کیا۔ ہاں، اللہ چاہتا تو وہ ہرگز نہ لڑتے، مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے[۱]۔ ع

(بقیہ صفحہ سابق) گروہ کے ذریعہ سے اللہ اس کا زور توڑ دیتا ہے۔ اگر کہیں ایسا ہوتا کہ ایک قوم ہی کا اقتدار زمین میں ہمیشہ قائم رکھا جاتا اور اس کی قہرمانی لازوال ہوتی تو یقیناً ملک خدا میں فسادِ عظیم برپا ہو جاتا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] مطلب یہ ہے کہ رسولوں کے آنے کے بعد جو لوگوں میں اختلافات ہوئے، کوئی ایمان لایا کوئی نہ لایا، اور اختلافات سے بڑھ کر لڑائیوں تک نوبتیں پہنچیں، تو یہ اس وجہ سے نہیں ہوا کہ اللہ بے بس تھا، اس کے پاس ان اختلافات اور لڑائیوں کو روکنے کا زور نہ تھا۔ نہیں، اگر اللہ چاہتا تو کسی کی مجال نہ تھی کہ انبیاء کی دعوت سے منہ موڑ سکتا اور کفر و بغاوت کی راہ پر چل سکتا اور اس کی زمین میں فساد برپا کر سکتا۔ مگر اللہ کی مشیت یہ تھی ہی نہیں کہ انسانوں سے ارادہ و اختیار کی آزادی چھین لی جائے، اور انھیں ایک خاص روش پر چلنے کے لیے مجبور کیا جائے۔ اس نے امتحان کی غرض سے انھیں اعتقاد و عمل کی راہوں میں انتخاب کی آزادی عطا کی ہے، اور انبیاء کو لوگوں کو کوتوال بنا کر نہیں بھیجا ہے کہ زبردستی انھیں ایمان و اطاعت کی طرف کھینچ لائیں بلکہ اس لیے بھیجا ہے کہ دلائل اور بینات سے لوگوں کو راستی کی طرف بلانے کی کوشش کریں۔ پس جس قدر اختلافات اور لڑائیوں کے ہنگامے ہوتے وہ سب اس وجہ سے ہوئے کہ اللہ نے لوگوں کو ارادے کی جو آزادی عطا کی تھی اس سے کام لے کر لوگوں نے یہ مختلف راہیں اختیار کر لیں، نہ اس وجہ سے کہ اللہ ان کو راستی پر چلانا چاہتا تھا مگر معاذ اللہ اُسے کامیابی نہ ہوئی۔

اے ایمان لانے والو جو کچھ مال متاع ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرو[۵۱] قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی، ظالم اصل میں وہ جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں[۵۲]

۵۱ مراد راہ خدا میں صرف کرنا ہے۔ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ جن لوگوں نے ایمان کی راہ اختیار کی ہے انھیں اس مقصد کے لیے، جس پر وہ ایمان لائے ہیں، مالی قربانیاں برداشت کرنی چاہییں۔

۵۲ کفر کی روش اختیار کرنے والوں سے مراد یا تو وہ لوگ ہیں جو اس حکم کی اطاعت سے انکار کریں اور اپنے مال کو خدا کی خوشنودی سے عزیز تر رکھیں، یا وہ لوگ ہیں جو اس دن پر اعتقاد نہ رکھیں یا یہ سمجھیں کہ وہاں نجات خریدنے کا یا دوستی و سفارش سے کام نکال لینے کا کوئی موقع ہوگا۔

مقالات

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

(۵)

عبادت

لغوی تحقیق عربی زبان میں عبودۃ، عبودیۃ اور عبدیۃ کے اصل معنی خضوع اور تذلل کے ہیں، یعنی تابع ہو جانا، رام ہو جانا، کسی کے سامنے اس طرح سپر ڈال دینا کہ اس کے مقابلہ میں کوئی مزاحمت یا انحراف و سرتابی نہ ہو اور وہ اپنے منشا کے مطابق جس طرح چاہے خدمت لے۔ اسی اعتبار سے اہلِ عرب اُس اونٹ کو بعیر معبّد کہتے ہیں جو سواری کے لیے پوری طرح رام ہو چکا ہو، اور اس راستے کو طریقِ معبّد کہتے ہیں جو کثرت سے پامال ہو کر ہموار بن گیا ہو۔ پھر اسی اصل سے اس مادہ میں غلامی، اطاعت، پوجا، ملازمت اور قید یا رکاوٹ کے مفہومات پیدا ہوئے ہیں، چنانچہ عربی لغت کی سب سے بڑی کتاب "لسان العرب" میں اس کی جو تشریح کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) العبد المملوک، خلاف الحُرّ۔ عبد وہ ہے جو کسی کی ملک ہو اور یہ لفظ حُرّ (آزاد) کی ضد ہے۔ تعبّد الرجل "آدمی کو غلام بنا لیا یا اس کے ساتھ غلام جیسا معاملہ کیا"۔ یہی معنی عبّدہٗ، أعبدہٗ، اور اِعتبدہٗ کے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے ثلثۃ انا خصمھم، رجل اعتبد محررا (وفی روایۃ اعبد محررا) یعنی تین آدمی ہیں جن کے خلاف قیامت کے دن میں مستغیث ہوں گا، من جملہ ان کے ایک وہ شخص ہے جو کسی آزاد کو غلام بنائے یا غلام کو آزاد کرنے کے بعد پھر اس سے غلام کا سا معاملہ کرے۔ حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہا تھا وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ "اور تیرا وہ احسان جس کا طعنہ تو مجھے دے رہا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا"۔

(۲) العبادۃ الطاعۃ مع الخضوع، "عبادت اس اطاعت کو کہتے ہیں جو پوری فرمانبرداری کے ساتھ ہو"۔ عَبَدَ الطَّاغُوتَ ای اطاعہ، "طاغوت کی عبادت کی یعنی اس کا فرمانبردار ہوگیا"۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ ای نطیع الطاعۃ التی یخضع معھا، "ہم تیری عبادت کرتے ہیں یعنی ہم تیری اطاعت پوری فرمانبرداری کے ساتھ کرتے ہیں"۔ اُعْبُدُوا رَبَّکُمْ ای اطیعوا ربکم، "اپنے رب کی عبادت کرو یعنی اس کی اطاعت کرو"۔ قَوْمُھُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ ای دائنون وکل من دان لملک فھو عابد لہ وقال ابن الانباری فلان عابد وھو الخاضع لربہ المستسلم المنقاد لامرہ، یعنی فرعون نے جو یہ کہا تھا کہ موسیٰ اور ہارون کی قوم ہماری عابد ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہماری تابع فرمان ہے، جو شخص کسی بادشاہ کا مطیع ہے وہ اس کا عابد ہے، اور ابن الانباری کہتا ہے کہ فلان عابد کے معنی ہیں "وہ اپنے مالک کا فرمانبردار اور اس کے حکم کا مطیع ہے"۔

(۳) عَبَدَہ عبادۃً ومعبداً ومعبدۃً تألّہ لہ، "اس کی عبادت کی، یعنی اس کو پوجا"۔ التعبد التنسک، "تعبّد سے مراد ہے کسی کا پرستار، پجاری بن جانا"۔ شاعر کہتا ہے اری المال عند الباخلین معبّدا، "میں دیکھتا ہوں کہ بخیلوں کے ہاں روپیہ پجتا ہے"۔

(۴) عَبِدَہ وعَبِدَ بہ لزمہ فلم یفارقہ، "عَبِدَہ اور عَبِدَ بہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ وابستہ ہوگیا اور جدا نہ ہوا، اس کا دامن تھام لیا اور چھوڑا نہیں"۔

(۵) ما عَبَدَکَ عنی ای ما حبسک، جب کوئی شخص کسی کے پاس آنے سے رک جائے تو وہ یوں کہے گا کہ ما عبدک عنی، یعنی کس چیز نے تجھے میرے پاس آنے سے روک دیا۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مادۂ عبد کا اساسی مفہوم کسی کی بالادستی و برتری تسلیم کرکے اس کے مقابلہ میں اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار ہو جانا، سرتابی و مزاحمت چھوڑ دینا اور اس کے لیے رام ہو جانا ہے۔ یہی حقیقت بندگی و غلامی کی ہے، لہٰذا اس لفظ سے اولین تصور جو ایک عرب کے ذہن میں پیدا

ہوتا ہے وہ بندگی و غلامی ہی کا تصور ہے۔ پھر چونکہ غلام کا اصل کام اپنے آقا کی اطاعت و فرماں برداری ہے اس لیے لازماً اس کے ساتھ ہی اطاعت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اور جبکہ ایک غلام اپنے آقا کی بندگی و اطاعت میں محض اپنے آپ کو سپرد ہی نہ کر چکا ہو بلکہ اعتقاداً اُس کی برتری کا قائل اور اس کی بزرگی کا معترف بھی ہو، اور اس کی مہربانیوں پر شکر و احسانمندی کے جذبہ سے بھی سرشار ہو تو وہ اس کی تعظیم و تکریم میں مبالغہ کرتا ہے، مختلف طریقوں سے اعترافِ نعمت کا اظہار کرتا ہے، اور طرح طرح سے مراسم بندگی بجالاتا ہے اسی کا نام پرستش ہے اور یہ تصورِ عبدیت کے مفہوم میں صرف اس وقت شامل ہوتا ہے جبکہ غلام کا محض سر ہی آقا کے سامنے جھکا ہوا نہ ہو بلکہ اس کا دل بھی جھکا ہوا ہو۔ رہے باقی دو تصورات تو وہ دراصل عبدیت کے ضمنی تصورات ہیں، اصلی اور بنیادی نہیں ہیں۔

لفظ عبادت کا استعمال قرآن میں اس لغوی تحقیق کے بعد جب ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب پاک میں یہ لفظ تمام تر پہلے تین معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں معنی اول و دوم ایک ساتھ مراد ہیں، کہیں صرف معنی دوم اور کہیں صرف معنی سوم مراد لیے گئے ہیں، اور کہیں تینوں معنی بیک وقت مقصود ہیں اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

عبادت بمعنی غلامی و اطاعت

ثُمَّ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ وَأَخَاهُ هَارُونَ بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِينٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا عَالِينَ فَقَالُوا أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ (مومنون۔ ۳)

پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور صریح دلیل ماموریت کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت کی طرف بھیجا مگر وہ تکبر سے پیش آئے کیونکہ وہ بااقتدار لوگ تھے، انھوں نے کہا کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں اور آدمی بھی وہ جن کی قوم ہماری عابد ہے۔

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدتَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ (الشعراء)

(فرعون نے جب موسیٰ کو طعنہ دیا کہ ہم نے تجھے اپنے ہاں بچپن سے پالا ہے تو موسیٰ نے کہا) اور تیرا وہ احسان جس کا تو مجھے طعنہ

دے رہا ہے یہی تو ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا عبد بنا لیا۔

دونوں آیتوں میں عبادت سے مراد غلامی اور اطاعت و فرماں برداری ہے۔ فرعون نے کہا کہ موسیٰ اور ہارون کی قوم ہماری عابد ہے، یعنی ہماری غلام اور ہمارے فرمان کی تابع ہے۔ اور حضرت موسیٰ نے کہا کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا عبد بنا لیا ہے، یعنی ان کو غلام بنا لیا ہے اور ان سے من مانی خدمت لیتا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ۔ (البقرہ - ۲۱)

اے ایمان والو اگر تم ہماری عبادت کرتے ہو تو ہم نے جو پاک چیزیں تمہیں بخشی ہیں انھیں کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو۔

اس آیت کا موقع و محل یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کے لوگ اپنے مذہبی پیشواؤں کے احکام اور اپنے آباؤ اجداد کے اوہام کی پیروی میں کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق طرح طرح کی قیود کی پابندی کرتے تھے۔ جب ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اگر تم ہماری عبادت کرتے ہو" تو ان ساری پابندیوں کو ختم کر دو اور جو کچھ ہم نے حلال کیا ہے اسے حلال سمجھ کر بے تکلف کھاؤ پیو۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے پنڈتوں اور بزرگوں کے نہیں بلکہ ہمارے بندے ہو، اور اگر تم نے واقعی اُن کی اطاعت و فرماں برداری چھوڑ کر ہماری اطاعت و فرماں برداری قبول کی ہے تو اب تمہیں حلت اور حرمت اور جواز اور عدمِ جواز کے معاملہ میں اُن کے بنائے ہوئے ضابطوں کے بجائے ہمارے ضابطہ کی پیروی کرنی ہوگی۔ لہٰذا یہاں بھی عبادت کا لفظ غلامی اور اطاعت ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُم بِشَرٍّ مِّن ذَٰلِكَ مَثُوبَةً عِندَ اللَّهِ مَن لَّعَنَهُ اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ (المائدہ - ۹)

کہو، میں بتاؤں تمہیں کہ اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ بُرا انجام کن لوگوں کا ہے؟ وہ جن پر اللہ کی پھٹکار ہوئی اور اس کا غضب ٹوٹا جن میں سے بہت سے لوگ بندر اور سور تک بنا دیے گئے، جنھوں نے طاغوت کی عبادت کی۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (النحل - ۵)	ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر یہ تعلیم دینے کے لیے بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے باز رہو۔
وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ أَن يَعْبُدُوهَا وَأَنَابُوا إِلَى اللَّهِ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ (الزمر - ۲)	اور خوشخبری ہے اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے طاغوت کی عبادت چھوڑ کر اللہ کی طرف رجوع کیا۔

تینوں آیتوں میں طاغوت کی عبادت سے مراد طاغوت کی غلامی اور اطاعت ہے جیسا کہ آگے چل کر اسی سلسلہ کے مضامین میں بہ تشریح بیان ہوگا، قرآن کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد ہر وہ ریاست و اقتدار، اور ہر وہ رہنمائی و پیشوائی ہے جو خدا سے باغی ہو کر خدا کی زمین میں اپنا حکم چلائے اور اس کے بندوں کو زور و جبر سے یا تحریص و اطماع سے یا گمراہ کن تعلیمات سے اپنا تابع امر بنائے۔ ایسے ہر اقتدار اور ایسی ہر پیشوائی کے آگے سر تسلیم خم کرنا اور اس کی بندگی اختیار کر کے اس کا حکم بجا لانا طاغوت کی عبادت ہے۔

عبادت بمعنی فرماں برداری اب اُن آیات کو لیجیے جن میں عبادت کا لفظ صرف معنی دوم میں استعمال ہوا ہے:

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ (یٰس - ۴)	اے بنی آدم! کیا میں نے تم کو تاکید نہ کی تھی کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے؟

ظاہر ہے کہ شیطان کی پرستش تو دنیا میں کوئی بھی نہیں کرتا، بلکہ ہر طرف سے اس پر لعنت و پھٹکار ہی پڑتی ہے۔ لہٰذا بنی آدم پر جو فرد جرم اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت کے روز لگائی جائیگی وہ اس بات کی نہ ہوگی کہ انھوں نے شیطان کو پوجا، بلکہ اس بات کی ہوگی کہ وہ شیطان کے کہے پر چلے اور اس کے احکام کی اطاعت کی اور جس جس راستہ کی طرف وہ اشارہ کرتا گیا اُس پر دوڑے چلے گئے۔

احْشُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَاهْدُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ ... وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ	(جب قیامت برپا ہوگی تو اللہ فرمائے گا) تمام ظالموں اور اُن کے ساتھیوں کو اور اُن معبودانِ غیر اللہ کو جن کی عبادت کی جاتی تھی جمع کرو اور انھیں جہنم کا راستہ دکھاؤ ..... پھر وہ

بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ قَالُوْۤا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ (الصّٰفّٰت - ۲)

آپس میں ایک دوسرے سے ردوکد کرنے لگیں گے۔ عبادت کرنے والے کہیں گے کہ تم ہی لوگ تھے جو خیر کی راہ سے ہمارے پاس آتے تھے۔ ان کے معبود جواب دیں گے کہ اصل میں تو تم خود ایمان لانے پر تیار نہ تھے، ہمارا کوئی زور تم پر نہیں تھا، تم آپ ہی نافرمان لوگ تھے۔

اس آیت میں عابدوں اور معبودوں کے درمیان جو سوال وجواب نقل کیا گیا ہے اس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ یہاں معبودوں سے مراد بُت اور دیوتا نہیں ہیں جن کی پوجا کی جاتی تھی، بلکہ وہ پیشوا اور رہنما ہیں جنھوں نے خیر طلب بن کر انسانوں کو گمراہ کیا، جو تقدس کے جامے پہن کر نمودار ہوئے جنھوں نے سجادوں اور تسبیحوں اور جُبّوں اور گلیموں سے بندگانِ خدا کو دھوکا دے کر اپنا معتقد بنایا، جنھوں نے اصلاح اور خیر خواہی کے دعوے کر کے شر اور فساد پھیلائے۔ ایسے لوگوں کی اندھی تقلید اور ان کے احکام کی بے چون وچرا اطاعت کرنے ہی کو یہاں عبادت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا (التوبہ - ۵)

انھوں نے اپنے علما اور مشائخ کو خدا کے بجائے اپنا رب بنالیا اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ ان کو ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔

یہاں علما اور مشائخ کو رب بنا کر ان کی عبادت کرنے سے مراد ان کو امر و نہی کا مختار ماننا اور خدا و پیغمبرِ خدا کی سند کے بغیر ان کے احکام کی اطاعت بجالانا ہے۔ اسی معنی کی تصریح روایاتِ صحیحہ میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی ہے جب آپ سے عرض کیا گیا کہ ہم نے اپنے علما اور مشائخ کی پرستش تو کبھی نہیں کی تو آپ نے جواب دیا کہ جس چیز کو انھوں نے حلال ٹھیرایا کیا تم نے اسے حلال نہیں سمجھ لیا؟ اور جسے انھوں نے حرام قرار دیا کیا تم نے اسے حرام نہیں مان لیا؟

عبادت بمعنی پرستش

اب تیسرے معنی کی آیات لیجیے۔ اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآن کی رو سے عبادت بمعنی پرستش میں دو چیزیں شامل ہیں، ایک یہ کہ کسی کے لیے سجدہ و رکوع اور دست بستہ قیام اور طواف اور آستانہ بوسی اور نذر و نیاز اور قربانی وغیرہ کے وہ مراسم ادا کیے جائیں جو بالعموم پرستش کی غرض سے ادا کیے جاتے ہیں قطع نظر اس سے کہ اسے مستقل بالذات معبود سمجھا جائے یا بڑے معبود کے ہاں تقرب اور سفارش کا ذریعہ سمجھ کر ایسا کیا جائے یا بڑے معبود کے ماتحت خدائی کے انتظام میں شریک سمجھتے ہوئے یہ حرکت کی جائے، دوسرے یہ کہ کسی کو عالمِ اسباب پر ذی اقتدار خیال کر کے اپنی حاجتوں میں اس سے دعا مانگی جائے، اپنی تکلیفوں اور مصیبتوں میں اس کو مدد کے لیے پکارا جائے اور خطرات و نقصانات سے بچنے کے لیے اس سے پناہ مانگی جائے۔ یہ دونوں قسم کے فعل قرآن کی رو سے یکساں پرستش کی تعریف میں آتے ہیں:

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ (المومن - ۷)

کہو، مجھے تو اس سے منع کر دیا گیا ہے کہ اپنے رب کی طرف سے صریح ہدایات پا لینے کے بعد میں اُن کی پرستش کروں جنھیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو۔

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ ..... فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ .... (مریم - ۳)

(ابراہیم نے کہا) میں تم کو اور اللہ کے ماسوا جنھیں تم پکارتے ہو ان سب کو چھوڑتا ہوں اور اپنے رب کو پکارتا ہوں ..... پس جب وہ ان سے اور اللہ کے سوا جن کی وہ عبادت کرتے تھے ان سب سے الگ ہو گیا تو ہم نے اسے اسحٰق جیسا بیٹا دیا ....

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا

اور اس سے زیادہ بہکا ہوا انسان اور کون ہو گا جو اللہ کو چھوڑ کر انھیں پکارے جو قیامت تک اس کی پکار کا جواب نہیں دے سکتے جنھیں خبر تک نہیں کہ اُن کو پکارا جا رہا ہے، اور جو روزِ حشر میں (جبکہ سب لوگ جمع کیے جائیں گے) اپنے اِن پکارنے والوں کے دشمن ہوں گے اور اِن کی عبادت کا انکار

بِعِبَادَتِهِمْ كَافِرِينَ (احقاف - ۱)

کریں گے۔[1]

تینوں آیتوں میں قرآن نے خود ہی تصریح کر دی ہے کہ یہاں عبادت سے مراد دعا مانگنا اور مدد کے لیے پکارنا ہے۔

بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ أَكْثَرُهُم بِهِم مُّؤْمِنُونَ (سبا - ۵)

بلکہ وہ جنوں کی عبادت کرتے تھے اور ان میں سے اکثر ان پر ایمان لائے ہوئے تھے۔

یہاں جنوں کی عبادت اور اُن پر ایمان لانے سے جو کچھ مراد ہے، اس کی تشریح سورۂ جن کی یہ آیت کرتی ہے:

وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (رکوع - ۱)

اور یہ کہ انسانوں میں سے بعض اشخاص جنوں میں سے بعض اشخاص کی پناہ ڈھونڈتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جنوں کی عبادت سے مراد ان کی پناہ ڈھونڈنا اور خطرات ونقصانات کے مقابلہ میں اُن سے حفاظت طلب کرنا ہے، اور ان پر ایمان لانے سے مراد ان کے متعلق یہ اعتقاد رکھنا ہے کہ وہ پناہ دینے اور حفاظت کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَقُولُ أَأَنتُمْ أَضْلَلْتُمْ عِبَادِي هَٰؤُلَاءِ أَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ ؟ قَالُوا سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنبَغِي لَنَا أَن نَّتَّخِذَ مِن دُونِكَ مِنْ أَوْلِيَاءَ (الفرقان - ۲)

جس روز اللہ ان کو اور ان کے اُن معبودوں کو جمع کرے گا جن کی یہ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں تو وہ اُن سے پوچھے گا کہ میرے ان بندوں کو تم نے بہکایا تھا یا یہ خود راہِ راست سے بہک گئے؟ وہ عرض کریں گے کہ سبحان اللہ! ہم کو کب زیبا تھا کہ حضور کو چھوڑ کر ہم کسی کو ولی و مددگار بنائیں۔

یہاں اندازِ بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ معبودوں سے مراد اولیاء، انبیاء اور صلحاء ہیں اور

[1] یعنی صاف کہیں گے کہ نہ ہم نے ان سے کہا کہ ہماری عبادت کرو، اور نہ ہمیں اس کی کبھی خبر ہوئی کہ یہ ہماری عبادت کرتے تھے۔

ان کی عبادت سے مراد اُن کو بندگی کی صفات سے بالاتر اور خدائی کی صفات سے متصف سمجھنا، ان کو غیبی امداد اور مشکل کشائی و فریاد رسی پر قادر خیال کرنا، اور ان کے لیے تعظیم کے وہ مراسم ادا کرنا ہے جو پرستش کی حد تک پہنچے ہوئے ہوں۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ أَهٰٓؤُلَآءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ قَالُوا سُبْحٰنَكَ أَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُونِهِمْ (سبا - ۵)

جس روز اللہ ان سب کو اکٹھا کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا کیا وہ تم تھی کی یہ لوگ عبادت کرتے تھے؟ تو وہ کہیں گے سبحان اللہ ہمیں ان سے کیا تعلق، ہمارا تعلق تو آپ سے ہے۔

یہاں فرشتوں کی عبادت سے مراد ان کی پرستش ہے جو ان کے استھان اور ہیکل اور خیالی مجسمے بنا کر کی جاتی تھی اور اس پوجا سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ ان کو خوش کر کے ان کی نظر عنایت اپنے حال پر مبذول کرائی جائے اور اپنے دنیوی معاملات میں ان سے مدد حاصل کی جائے۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ۔ (یونس - ۲)

وہ اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهٖٓ أَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر - ۱)

جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا ولی بنا رکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔

یہاں بھی عبادت سے مراد پرستش ہے اور اس غرض کی بھی تشریح کر دی گئی ہے جس کے لیے یہ پرستش کی جاتی تھی۔

عبادت بمعنی بندگی و اطاعت و پرستش ان مثالوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن میں عبادت کا لفظ کہیں غلامی و اطاعت کے معنی میں استعمال ہوا ہے، کہیں مجرد اطاعت کے معنی میں اور کہیں پرستش کے معنی

ہیں۔ اب قبل اس کے کہ ہم وہ مثالیں پیش کریں جن میں لفظ عبادت ان تینوں مفہومات کا جامع ہے، ایک مقدمہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

اوپر جتنی مثالیں پیش کی گئی ہیں ان سب میں اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کا ذکر ہے۔ جہاں عبادت سے مراد غلامی و اطاعت ہے وہاں معبود یا تو شیطان ہے، یا وہ باغی انسان ہیں جنھوں نے طاغوت بن کر خدا کے بندوں سے خدا کے بجائے اپنی بندگی و اطاعت کرائی، یا وہ رہنما و پیشوا ہیں جنھوں نے کتاب اللہ سے بے نیاز ہو کر اپنے خود ساختہ طریقوں پر لوگوں کو چلایا۔ اور جہاں عبادت سے مراد پرستش ہے وہاں معبود یا تو انبیاء، اولیاء اور صلحاء ہیں جنھیں ان کی تعلیم و ہدایت کے خلاف معبود بنا لیا گیا، یا فرشتے اور جن ہیں جن کو محض غلط فہمی کی بنا پر فوق الطبعی ربوبیت میں شریک سمجھ لیا گیا، یا خیالی طاقتوں کے بُت اور تماثیل ہیں جو محض شیطانی اغوا سے مرکزِ پرستش بن گئے۔ قرآن ان تمام اقسام کے معبودوں کو باطل اور ان کی عبادت کو غلط ٹھیراتا ہے، خواہ ان کی غلامی کی گئی ہو یا اطاعت یا پرستش۔ وہ کہتا ہے کہ تمھارے یہ سب معبود جن کی تم عبادت کر رہے ہو اللہ کے بندے اور غلام ہیں، نہ انھیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ان کی عبادت کی جائے اور نہ ان کی عبادت سے بجز نامرادی اور ذلت و رسوائی کے تم کو کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ حقیقت میں ان کا اور ساری کائنات کا مالک اللہ ہی ہے، اسی کے ہاتھ میں تمام اختیارات ہیں، لہٰذا عبادت کا مستحق اکیلے اللہ کے سوا کوئی نہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ... وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ (اعراف - ۲۴)	اللہ کو چھوڑ کر جنھیں تم پکارتے ہو وہ تو محض بندے ہیں جیسے تم خود بندے ہو۔ انھیں پکار کر دیکھ لو، اگر تمھارا عقیدہ ان کے بارے میں صحیح ہے تو وہ تمھاری پکار کا جواب دیں.... اللہ کے ماسوا جنھیں تم پکارتے ہو وہ نہ تمھاری کوئی مدد کر سکتے ہیں نہ خود اپنی مدد پر قادر ہیں۔
وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ،	یہ لوگ کہتے ہیں کہ رحمان نے کسی کو بیٹا بنایا ہے! وہ بالاتر

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ ۝ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُم بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ (انبیاء - ۲)

ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو جنھیں یہ اس کی اولاد کہتے ہیں وہ دراصل اس کے بندے ہیں جن کو عزت دی گئی ہے۔ ان کی اتنی مجال نہیں کہ خود سبقت کر کے اللہ کے حضور کچھ عرض کر سکیں بلکہ جیسا وہ حکم دیتا ہے اُسی کے مطابق وہ عمل کرتے ہیں۔ جو کچھ وہ جانتے ہیں اُسے بھی اللہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے پوشیدہ ہے اس کی بھی اللہ کو خبر ہے۔ وہ اللہ کے حضور کسی کی سفارش نہیں کر سکتے بجز اُس کے جس کی سفارش خود اللہ ہی قبول کرنا چاہے۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ اللہ کے خوف سے سہمے رہتے ہیں۔

وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَٰنِ إِنَاثًا (زخرف - ۲)

اِن لوگوں نے فرشتوں کو جو دراصل رحمٰن کے بندے ہیں دیویاں بنا رکھا ہے۔

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۚ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ (صٰفّٰت - ۵)

انھوں نے جنوں کے اور خدا کے درمیان نسبی رشتہ فرض کر لیا ہے حالانکہ جن خود بھی جانتے ہیں کہ ایک روز انھیں حساب کے لیے اس کے حضور پیش ہونا ہے۔

لَّن يَسْتَنكِفَ الْمَسِيحُ أَن يَكُونَ عَبْدًا لِّلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ ۚ وَمَن يَسْتَنكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا (النساء - ۲۴)

نہ مسیح نے کبھی اس کو اپنے لیے عار سمجھا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتوں نے۔ اور جو کوئی اُس کی بندگی و غلامی میں عار سمجھے اور تکبر کرے (وہ بھاگ کر جا کہاں سکتا ہے) ایسے سب لوگوں کو اللہ اپنے حضور کھینچ بلائے گا۔

الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ (الرحمٰن - ۱)

سورج اور چاند سب گردش میں لگے ہیں اور تارے اور درخت سب خدا کے آگے سر اطاعت جھکائے ہوئے ہیں۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ ۚ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ

ساتوں آسمان اور زمین اور جس قدر موجودات آسمان و زمین میں ہیں سب کے سب اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں، کوئی چیز ایسی نہیں

ولکن لا تفقھون تسبیحھم (بنی اسرائیل — ۵)

جو حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو، مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے۔

ولہ من فی السموات والارض کل لہ قانتون (الروم — ۳)

آسمانوں اور زمین کی کُل موجودات اس کی مِلک ہے اور ساری چیزیں اس کے فرمان کی تابع ہیں۔

ما من دابۃ الا ھو اٰخذ بناصیتھا۔ (ہود — ۵)

کوئی جاندار ایسا نہیں جو اللہ کے قبضۂ قدرت میں جکڑا ہوا نہ ہو۔

ان کل من فی السموات والارض الا اٰتی الرحمٰن عبدا لقد احصٰھم وعدھم عدا وکلھم اٰتیہ یوم القیٰمۃ فردا (مریم — ۶)

زمین اور آسمانوں کے باشندوں میں سے کوئی ایسا نہیں جو رحمٰن کے سامنے غلام کی حیثیت سے پیش ہونے والا نہ ہو۔ اس نے سب کا شمار کر رکھا ہے اور قیامت کے روز سب اُس کے حضور فرداً فرداً پیش ہوں گے۔

قل اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علی کل شیء قدیر (آل عمران — ۳)

کہو، خدایا! مُلک کے مالک! تو جسے چاہے مُلک دے اور جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے، بھلائی تیرے اختیار میں ہے، یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے۔

اس طرح اُن سب کو جن کی عبادت کسی شکل میں کی گئی ہے، اللہ کا غلام اور بے اختیار ثابت کر دینے کے بعد قرآن تمام جن و انس سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہر مفہوم کے لحاظ سے عبادت صرف اللہ کی ہونی چاہیے، غلامی ہو تو اس کی، اطاعت ہو تو اس کی، پرستش ہو تو اُس کی، ان میں سے کسی نوع کی عبادت کا بھی شائبہ تک غیر اللہ کے لیے نہ ہو۔

ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت (النحل — ۵)

ہم نے ہر قوم میں ایک رسول یہی پیغام دے کر بھیجا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے پرہیز کرو۔

وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى (الزمر — ۲)

خوشخبری ہے ان کے لیے جنھوں نے طاغوت کی عبادت سے پرہیز کیا اور اللہ کی طرف رجوع کر لیا۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (یٰسٓ — ۴)

اے بنی آدم کیا میں نے تم کو تاکید نہ کی تھی کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا، وہ تمھارا کھلا دشمن ہے، اور میری عبادت کرنا، یہی سیدھا راستہ ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ..... وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا۔ (التوبہ — ۵)

انھوں نے اللہ کے بجائے اپنے علما اور مشائخ کو اپنا رب بنا لیا ... حالانکہ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ ایک الٰہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (بقرہ — ۲۱)

اے ایمان لانے والو! اگر تم نے واقعی ہماری ہی عبادت اختیار کی ہے تو جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں انھیں بے تکلف کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو۔

ان آیات میں اللہ کے لیے اُس عبادت کو مخصوص کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو بندگی و غلامی اور اطاعت و فرمانبرداری کے معنی میں ہے، اور اس کے لیے صاف قرینہ موجود ہے کہ طاغوت اور شیطان اور احبار و رہبان اور آبا و اجداد کی اطاعت و بندگی سے پرہیز کر کے اللہ کی اطاعت و بندگی اختیار کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (المومن — ۷)

کہو، مجھے اس سے منع کیا گیا ہے کہ میں اپنے رب کی طرف سے واضح ہدایات پا لینے کے بعد اُن کی عبادت کروں جنھیں تم اللہ کے بجائے پکارتے ہو۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں رب العٰلمین کے آگے سرِ تسلیم خم کر دوں۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ (المومن — ٦)	اور تمھارے ربّ نے فرمایا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمھاری پکار کا جواب دوں گا، اور جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ یقیناً جہنم میں جھونکے جائیں گے۔
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ، إِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ (فاطر — ٢)	وہی اللہ تمھارا رب ہے، بادشاہی اُسی کی ہے، اس کے سوا تم جن کو پکارتے ہو ان کے اختیار میں ذرہ برابر کچھ نہیں، تم انھیں پکارو تو وہ تمھاری پکار سُن نہیں سکتے اور سُن بھی لیں تو جواب نہیں دے سکتے اور قیامت کے روز وہ تمھارے اس شرک کا انکار کریں گے۔
قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (المائدہ — ١٠)	کہو، کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہو جو تمھیں نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتے ہیں نہ نفع پہنچانے کی؟ سب کچھ سننے اور جاننے والا تو اللہ ہی ہے۔

ان آیات میں اس عبادت کو اللہ کے لیے مختص کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جو پرستش کے معنی میں ہے، اور اس کے لیے بھی صاف قرینہ موجود ہے کہ عبادت کو دعا کے مترادف کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے اور ماقبل ومابعد کی آیات میں اُن معبودوں کا ذکر پایا جاتا ہے جنھیں فوق الطبعی ربوبیت میں اللہ کا شریک قرار دیا جاتا تھا۔

اب کسی صاحب بصیرت آدمی کے لیے یہ سمجھ لینا کچھ بھی مشکل نہیں کہ جہاں جہاں قرآن میں اللہ کی عبادت کا ذکر ہے اور آس پاس کوئی قرینہ ایسا موجود نہیں ہے جو لفظ عبادت کو اس کے مختلف مفہومات میں سے کسی ایک مفہوم کے لیے خاص کرتا ہو، ایسے تمام مقامات میں عبادت سے مراد غلامی، اطاعت اور پرستش تینوں مفہوم ہوں گے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیات کو دیکھیے:

إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي (طٰہٰ - ۱)

میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی الٰہ نہیں لہذا تو میری ہی عبادت کر۔

ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ (انعام - ۱۳)

وہی اللہ تمہارا رب ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، ہر چیز کا خالق، لہذا تم اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر شے کی خبر گیری کا متکفل ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْ دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (یونس - ۱۱)

کہو کہ لوگو! اگر تمہیں ابھی تک تحقیق معلوم نہیں ہے کہ میرا دین کیا ہے تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کرتا، بلکہ میں اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں شامل ہو جاؤں۔

مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (یوسف - ۵)

اللہ کے ماسوا جن کی تم عبادت کرتے ہو ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے لیے کوئی دلیلِ معبودیت نازل نہیں کی ہے، اقتدار صرف اللہ کے لیے خاص ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ خود اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے، یہی سیدھا طریقہ ہے۔

وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (ہود - ۱۰)

آسمانوں اور زمین کی جس قدر حقیقتیں بندوں سے پوشیدہ ہیں ان کا علم اللہ ہی کو ہے اور سارے معاملات اسی کی سرکار میں پیش ہوتے ہیں، لہذا تو اسی کی عبادت کر اور اسی پر بھروسہ رکھ۔

لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ

جو کچھ ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہم سے پوشیدہ ہے

ذَالِكَ، وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا، رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ (مریم - ۴)

اور جو کچھ ان دونوں حالتوں کے درمیان ہے، سب کا مالک وہی ہے، اور تیرا رب بھولنے والا نہیں ہے، وہ مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں۔ لہٰذا تو اُسی کی عبادت کر اور اس کی عبادت پر ثابت قدم رہ۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (کہف - ۱۲)

پس جو اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو وہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی اور کی عبادت شریک نہ کرے۔

کوئی وجہ نہیں کہ ان آیات اور ایسی ہی دوسری تمام آیات میں عبادت کے لفظ کو محض پرستش یا محض بندگی و اطاعت کے لیے مخصوص ٹھیرالیا جائے۔ اس طرح کی آیات میں دراصل قرآن اپنی پوری دعوت کو پیش کرتا ہے، اور ظاہر ہے کہ قرآن کی دعوت یہی ہے کہ بندگی، اطاعت، پرستش جو کچھ بھی ہو اللہ کی ہو، لہٰذا ان مقامات پر عبادت کے معنی کو کسی ایک مفہوم میں محدود کرنا حقیقت میں قرآن کی دعوت کو محدود کرنا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کی دعوت کا ایک محدود تصور لے کر ایمان لائیں گے وہ اس کی ناقص و ناتمام پیروی کریں گے۔ (باقی)

اعلان

تفسیر سورۂ فاتحہ

از افادات مولانا حمید الدین فراہی

(۲)

دوسری فصل

۱۔ عملی اور قولی تواتر (مثلاً حدیث خداج اور حدیث قسمت الصلوٰۃ بینی و بین عبدی) سے یہ بات ثابت ہے کہ یہ نماز کی سورت ہے۔ اس کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو جو نماز سکھائی تھی، اس میں بھی قریب قریب یہی کلمات ہم کو ملتے ہیں۔ گو نصاریٰ نے اس کے بعض الفاظ اور بعض الفاظ کے مدلولات فراموش کر دیے جیسا کہ قرآن مجید میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ (اور ان لوگوں سے جنھوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں ہم نے میثاق لیا پس انھوں نے بھلا دیا اس کا ایک حصہ جس کے ذریعہ سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی) ہم یہاں اس دعا کو نقل کرتے ہیں تاکہ فاتحہ کے ساتھ اس کی مطابقت اور پھر قرآن کی فضیلت نمایاں ہو سکے۔ لوقا باب ۱۱۔۴ میں ہے:

"پھر ایسا ہوا کہ وہ کسی جگہ دعا کر رہا تھا جب کر چکا تو اس کے شاگردوں میں سے ایک نے اس سے کہا اے خداوند! جیسا یوحنا نے اپنے شاگردوں کو دعا کرنا سکھایا تو بھی ہمیں سکھا۔ اس نے اُن سے کہا جب تم دعا کرو تو کہو اے ہمارے آسمانی باپ! تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہی آئے ٥ تیری مرضی زمین پر بھی پوری ہو جس طرح آسمان میں پوری ہوتی ہے ٥ ہماری روز کی روٹی ہمیں ہر روز دیا کرو اور ہمارے گناہ معاف کر کیونکہ ہم بھی اپنے ہر قرضدار کو معاف کرتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں نہ لا بلکہ ہمیں شر سے نجات دے ٥"

متی میں اس کے بعد یہ الفاظ بھی ہیں:

"تیرے ہی لیے بادشاہی، قوت اور عظمت ہے ابد تک۔ آمین ٥"

متی کے اکثر نسخوں میں یہ فقرہ نہیں تھا جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ بطور مقتدیوں کے جواب کے بڑھا دیا گیا ہے۔ اِن فقروں پر غور کروگے تو فاتحہ کے ساتھ انکی مشابہت نہایت آسانی کے ساتھ واضح ہوجائے گی انجیل کے الفاظ "اے آسمانی باپ" "اے رب" کی خرابی ہیں۔ آل عمران، مائدہ، مریم اور زخرف وغیرہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کا قول ان لفظوں میں نقل ہوا ہے اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ (بے شک اللہ میرا رب اور تمھارا رب ہے پس اُسی کی بندگی کرو)

سبحٰنك (تیرا نام پاک مانا جائے) ہمارے "الحمد للہ" کی طرح ہے لیکن "سبحٰنک" صرف تعظیم وتنزیہہ ہے اور "الحمد" جیسا کہ واضح ہوگا تعظیم اور شکر دونوں پر مشتمل ہے "تیری بادشاہی آئے، زمین میں بھی تیری مرضی پوری ہو جس طرح آسمان میں پوری ہوتی ہے" مالک یوم الدین سے مشابہہ ہے۔ لیکن یہ روزِ جزا کی دعا ہے اور "مالک یوم الدین" اذعان وتوکل کا کلمہ ہے۔ ہمارے ہاں روزِ جزا کے لیے دعا سے احتراز کیا گیا ہے کیونکہ سورہ شوریٰ میں فرمایا گیا ہے يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ (اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں وہ لوگ جو اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ پر جو ایمان رکھتے ہیں اس سے ڈرتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ وہ واقع ہوکے رہے گی) لیکن حضرت مسیحؑ نے اس کے لیے دعا فرمائی اور ان کے لیے یہ دعا اس وجہ سے جائز ہوئی کہ وہ اپنے بعد ایک آسمانی بادشاہی کے ظہور کی بشارت دے رہے تھے اور یہ آسمانی بادشاہی روزِ جزا کے ظہور کے علاوہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر بھی مشتمل تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس دعا کے بموجب دنیا کے لیے وہ شریعتِ فاصلہ نازل فرمائی جو ازل سے مقدر تھی۔ انجیل میں کتنی آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ "آسمانی بادشاہی" سے مراد آنحضرت صلعم کی بعثت ہے۔ آیت وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ کے تحت ان شاء اللہ ہم اس کی پوری تفصیل کریں گے آنحضرت صلعم کی بعثت کے بعد آسمانی بادشاہی کا ایک جزء پورا ہوچکا تھا۔ اب صرف دوسرا جزء، روزِ جزا کا ظہور، باقی رہ گیا تھا اس لیے آنحضرت صلعم نے دعا نہیں فرمائی بلکہ حمد واعترافِ ربوبیت کے بعد توکل ورجاء کا اظہار کیا چنانچہ مشہور حدیث ہے کہ "نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان تقسیم ہے" یہاں تک فرمایا کہ "جب بندہ مالک یوم الدین کہتا ہے"

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے اپنے تئیں میرے حوالے کر دیا۔ اور ظاہر ہے کہ اس امر میں تفویض ہی بہتر ہے۔
"ہماری روز کی روٹی ہمیں روز دیا کر" بھی محتاج تفصیل ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ تمثیلوں میں باتیں کرتے ہیں۔ روٹی سے وہ "روح القدس" مراد لیتے تھے جس سے صلحاء و ابرار کی اصلی زندگی ہے۔ چنانچہ دعا کی تعلیم کے بعد اپنے عام طریقہ کے مطابق انھوں نے خود اس کی تفسیر بھی فرما دی "اگر تم برے ہو کر اپنے بچوں کو اچھی چیزیں دینا جانتے ہو تو آسمانی باپ (پروردگار) اپنے مانگنے والوں کو روح القدس کیوں نہ دے گا"۔ دوسری جگہ فرمایا "لکھا ہوا ہے (یعنی موسیٰ کے صحیفہ میں) کہ انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے (یعنی اس کے امر و حکم سے زندگی پاتا ہے، پس تمھاری زندگی اس کی شریعت کی پابندی میں ہے)۔ یہ حضرت عیسیٰ کے اسی قول کی طرف اشارہ ہے کہ "آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ جو کچھ خداوند کے منہ سے نکلتا ہے اس سے جیتا ہے" پس "ہمیں رعز کی روٹی روز دیا کر" کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں وہ چیز عنایت فرما جو ہماری ابدی زندگی کا ذریعہ ہو یعنی وہ روح ہدایت جو صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتی ہے چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام نے دعا کی شرح کرتے ہوئے خود اس کی طرف اشارہ فرما دیا۔ متی میں ہے "تنگ دروازہ میں داخل ہو وہ دروازہ کشادہ اور وہ راستہ چوڑا ہے جو موت کی طرف لے جاتا ہے اور اس میں داخل ہونے والے بہت ہیں اور وہ دروازہ بہت تنگ اور وہ راستہ بہت پتلا ہے جو زندگی کی طرف لے جاتا ہے اور اس کے چلنے والے بہت تھوڑے ہیں"۔ اس میں زندگی کے راستہ کی مثال تنگ راستہ سے دی ہے اور یہی وہ سیدھی راہ (صراط مستقیم) ہے جو بندے کو پروردگار کے پاس پہنچاتی ہے اور وہی زندگی کا سرچشمہ ہے کیونکہ زندگی دراصل یہ ہے کہ ہم اپنے پورے دل اور پوری جان سے اللہ تعالیٰ سے محبت کریں اور وہ ہدایت جو انبیاء علیہم السلام لے کر آئے ہیں اسی زندگی کی طرف رہبری کرنے والا راستہ ہے قرآن مجید میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارات ہیں۔ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (کیا جو مردہ رہا ہو پھر ہم نے اس کو زندگی بخشی ہو اور اس کو روشنی دی ہو جس کو لے کر وہ لوگوں میں چلتا ہو اس کے مانند ہوگا جو تاریکیوں کے اندر ہو اور ان سے نکلنے والا نہ ہو)

اس آیت میں ایمان کو زندگی اور اتباعِ شریعت کو روشنی لے کر چلنے سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ دونوں چیزیں لازم ملزوم ہیں۔ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں جیسا کہ فرمایا ہے وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس نے صراطِ مستقیم کی ہدایت پائی)۔

یہ انجیل کے فقرات کی شرح تھی جس کی تائید قرآن مجید کی اُن آیات سے ہوتی ہے جن میں جگہ جگہ حضرت عیسیٰ کے اقوال کی ترجمانی کی گئی ہے مثلاً اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (بے شک اللہ میرا اور تمھارا رب ہے پس اسی کی بندگی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے) یعنی اللہ واحد کی بندگی جو اس کی بھیجی ہوئی شریعت کی اطاعت پر شامل ہے۔ پس حضرت مسیح کی دعا ہماری دعا "اھدنا الصراط المستقیم" کے ہم معنی ہے اور ان کا قول "ہمارے گناہ معاف کر ہم بھی اپنے ہر قرضدار کو معاف کرتے ہیں" عفو کی التجا عمل عفو کے وسیلہ سے ہے۔ "ہم ایاک نعبد و ایاک نستعین" میں ہر اچھے کام کے کرنے اور ہر بُرے کام سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد چاہتے ہیں۔ ہم نے عفو اور اجر کے معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا ہے اور مختلف پہلوؤں سے دعا کے ادب کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ ہم نے یہ نہیں کہا کہ "ہماری مدد کر" اور نہ یہ ہی کہا کہ "ہماری مدد کر کیونکہ ہم تیری مخلصانہ بندگی کرتے ہیں"۔ ہم نے وسیلہ کا ذکر کنایہ سے کیا ہے یعنی یہ کہ ہم تیرے سوا کسی کو معبود نہیں بناتے۔ لیکن ہماری دعا دو وسیلوں پر مشتمل ہے کیونکہ "ایاک نستعین" خود بھی ایک وسیلہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے تیرے سوا کسی کو مستعان نہیں بنایا۔ اور یہ معلوم ہے کہ یہی دو وسیلے سب سے بڑے وسیلے ہیں۔ تمام احکام میں سب سے بڑا حکم توحید ہے۔ حضرت عیسیٰ سے پوچھا گیا کہ "سب سے پہلا حکم کیا ہے"؟ انھوں نے فرمایا کہ "سن لے اسرائیل! اللہ ہمارا رب ایک ہے۔ اور یہ کہ تو اپنے خداوند سے محبت کر اپنے سارے دل، اپنی ساری جان، اپنی ساری عقل اور اپنی ساری قوت سے۔ یہ سب سے پہلا حکم ہے"۔ یعنی موسیٰ کی شریعت میں اسی طرح آیا ہے، اور توحید ہر نبی کی اولین تعلیم ہے۔ سورۂ ہود وغیرہ میں اس کے نہایت واضح شواہد موجود ہیں۔

"اور ہمیں آزمائش میں نہ لا اور شر سے بچا"۔ یعنی آزمائش کی لغزشوں سے بچا کہ جمنے کے بعد قدم اکھڑنے نہ پائیں۔
یہ دعا حضرت مسیح کے حسب حال ہے۔ انجیل میں آزمائش سے بچنے کی دعا بہت ہے۔ اور اس کی وجہ ان کی خشیت اور

آزمائشوں کی کثرت ہے۔ لیکن آزمائش اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ کسی صورت میں اس سے مفر نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (اس نے پیدا کیا ہے موت اور زندگی کو تاکہ تم کو جانچے کہ تم میں کس کا عمل بہترین ہے) دوسری جگہ ارشاد ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (کیا لوگوں نے گمان کر رکھا ہے کہ مجرد یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کی جانچ نہیں ہوگی، حالانکہ ہم نے جانچا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے گذرے) اس کے علاوہ بہت سے انبیاء کی آزمائشیں بھی بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت ارشاد ہے وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (جبکہ ابراہیم کو اس کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا تو اس نے پوری کردیں فرمایا میں تم کو لوگوں کا امام بناؤں گا) اسی طرح آدم علیہ السلام کو جنت کے درخت اور نوح علیہ السلام کو ان کے بیٹے کے بارے میں آزمایا اور فرمایا اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ جاہلوں میں سے مت بنو) چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے توبہ و استغفار کیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی نسبت ہے وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ (اور داؤد نے گمان کیا کہ ہم نے اس کو آزمایا پس اس نے اپنے رب سے مغفرت مانگی) اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسبت ہے وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ (اور ہم نے سلیمان کو آزمایا اور ڈالدیا اس کے تخت پر ایک دھڑ پھر وہ ہماری طرف متوجہ ہوا) حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا ابتلاء یہود کے صحیفوں میں مذکور ہے یہاں تک کہ ان لوگوں نے یردن کے اُسی پار انتقال کیا اور ارض موعود تک قوم کی رہبری نہ کرسکے۔ حضرت مسیحؑ کے ابتلاء کی تفصیل آگے آئے گی۔ حضرت یوسفؑ کی سرگذشتِ امتحان معلوم ہے۔ حضرت ایوبؑ کے شکوے سفر ایوب میں دیکھو۔ حضرت یحییٰؑ کی آزمائش قتل سے ہوئی۔ یہ باتیں سب کو معلوم ہیں۔ جو نہیں معلوم ہیں ان کو اسی عام اور ہمہ گیر کلیہ سے سمجھ لینا چاہیے جو خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا اور اس مضمون کی دوسری آیات میں بیان ہوا ہے۔

ان باتوں کے باوجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی خشیت کی شدت اور اپنی امت کی کمزوری

کی وجہ سے برابر آزمائش سے پناہ مانگتے رہے۔ ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی چالیس دن تک سخت آزمائش ہوئی اور ویسے تو ان کی ساری زندگی آزمائشوں کا ایک سلسلہ ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھایا اور زمین کے فتنوں سے نجات بخشی جیسا کہ قرآن مجید میں وارد ہے اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (میں تم کو اپنی طرف اٹھانے والا اور کافروں سے نجات دینے والا ہوں) اسی طرح ان کی امت کو بھی اللہ تعالیٰ نے طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈالا اور جو ان میں اہل ایمان تھے ان کو راہِ حق پر ثابت قدم رکھا۔ سورہ بروج میں اس کے اشارات موجود ہیں اور تاریخ تو ان کی آزمائش و استقامت کے واقعات سے معمور ہے (دعا کے اس فقرہ کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس ہولناک فتنہ کو دیکھ لیا تھا جو آپ کے لیے اور آپ کی امت کے لیے منہ کھولے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کی پوری تفصیل سامنے لانے کے لیے اُن واقعات کو یاد کرنا چاہیے جو آپ کی امت کو پیش آئے اور جن کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ حضرت نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے سوا ان کی نجات کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہ گئی)

اور یہ جو حضرت مسیح نے فرمایا کہ "ہمیں شر سے نجات دے" تو اللہ تعالیٰ نے ان کو نجات دی اور جس طریقہ سے انھوں نے مانگی تھی اس سے بہتر طریقہ پر نجات دی۔ لیکن اس امر کو یاد رکھنا چاہیے کہ طلب نجات کے ساتھ ساتھ وہ مرضیِ الٰہی پر بھی راضی تھے جو اصل دولتِ جاودانی ہے۔ انجیل کا وہ منظر میری چشمِ تصور کے سامنے ہے جبکہ حضرت مسیح علیہ السلام کوہِ زیتون پر مقامِ جسمنی میں حواریوں سے بالکل الگ تھلگ اللہ کے حضور گریہ وزاری کر رہے ہیں اور یہ دعا کر رہے ہیں کہ "اے خداوند! یہ پیالہ مجھ سے ہٹا لے، تو ہر بات پر قادر ہے لیکن میں اپنی مرضی پر تیری مرضی کو ترجیح دیتا ہوں، پس تیری ہی مرضی پوری ہو" آپ نے اپنے حواریوں کو بھی حکم دیا کہ دعا میں شریک ہوں لیکن وہ سو گئے۔ آپ بار بار ان کے پاس آتے اور پلٹ کے پھر جاتے اور دعا و مناجات میں سرگرم ہوتے۔ وہ ساعت بھی نگاہِ تخیل کے سامنے ہے جب تمام اسباب و وسائل کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور آپ پکار اٹھتے ہیں "خداوندا خداوندا تو نے کیوں مجھے چھوڑ دیا"۔ وہ وقت بھی قابلِ لحاظ ہے جبکہ موت کا پیالہ ان کے ہونٹوں سے لگ جاتا ہے لیکن

اللہ تعالیٰ اس کو ہٹا دیتا ہے اور ان کو اٹھا کر کافروں کو نجات بخشتا ہے۔ اسی طرح ان کی امت کے اُن اہل ایمان کو بھی اللہ تعالیٰ نے نجات دی جو نبی امی صلعم پر ایمان لائے جس کی انھوں نے خوشخبری دی تھی اور آئندہ بھی جو ایمان لائیں گے وہ نجات پائیں گے۔ پس امت کے مخلصین کے بارے میں آپ کی دعا قبول ہوئی۔ وہ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے اور آئندہ داخل ہوتے رہیں گے۔ لیکن ظالموں کے باب میں جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا نہیں قبول ہوئی اسی طرح آپ کی دعا بھی نہیں قبول ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور اس کا جواب قرآن مجید میں یوں مذکور ہے قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ (پوچھا اور میری اولاد میں سے ؟ فرمایا میرا عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہیں) یہ تفصیل ہوئی ان کی دعا کے اس فقرہ کی کہ "ہم کو فتنہ میں نہ ڈال اور شر سے نجات دے"۔

اس کو واضح کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ فقرہ توضیح مزید ہے اس فقرہ کی کہ "ہمیں رزق کی روٹی دیا کر"۔ کیونکہ روٹی سے مراد، جیسا کہ بیان ہوا، روح قدس اور روح ہدایت ہے۔ تو جس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت بخشی اس کو لاریب فتنہ اور ہر قسم کے روحانی شر سے نجات بخشی۔ پس یہ اصل ہدایت کی دعا ہے۔ پھر بعد کی تفسیر سے انھوں نے یہ بات واضح فرما دی کہ اس زندگی کا دروازہ تنگ اور اس کا راستہ پتلا ہے، جس سے یہ بات صاف ہو گئی کہ اس سے مراد وہ ہدایتِ الٰہی ہے جس کو انبیاء علیہم السلام لے کر آئے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہ دعا دراصل شریعت کے اہتمام اور اس فتنۂ ضلالت کے سدباب کے لیے تھی جس کا آپ کو اپنی امت کے متعلق اندیشہ تھا اور جس کی ایک عبرت انگیز مثال یہود کی زندگی میں موجود تھی کہ خود مسیح علیہ السلام کی بعثت ان کے قبولِ حق کی راہ میں ایک پتھر بن گئی جیسا کہ انجیل میں اس کی تصریح ہے اور خود قرآن نے بھی اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے وَلَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَأَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ رُسُلًا، كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَى أَنْفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ، وَحَسِبُوا أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُوا وَصَمُّوا ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوا وَصَمُّوا كَثِيرٌ مِنْهُمْ (مائدہ) (اور ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف رسول بھیجے،

جب جب آیا ان کے پاس کوئی رسول ایسی باتیں لے کر جو ان کی خواہشوں (بدعات) سے میل نہ کھاتیں تو ایک گروہ کا انھوں نے انکار کر دیا اور ایک جماعت کو وہ قتل کرتے رہے اور انھوں نے گمان کیا کہ کوئی فتنہ نہ ہوگا پس اندھے بہرے بن گئے، پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کی پھر اندھے بہرے بن گئے ان میں سے بہتیرے

ٹھیک اسی طرح ہمارے ہاں سورۂ فاتحہ میں "صراط الذین انعمت علیہم" کے الفاظ اس طریق ہدایت کی توضیح کر رہے ہیں جس کا ذکر اوپر "اہدنا الصراط المستقیم" میں گذر چکا ہے اور یہ غایت درجہ اہتمام ہے اس ہدایت کے لیے جس میں ایک امت بھٹک چکی ہے اور ایک خدا کے قہر و غضب کی مستحق ٹھیر چکی ہے اور چونکہ قرآن مجید ایک واضح ترین کتاب ہے اس لیے اس اجمال کی بھی اس نے ایسی وضاحت فرما دی ہے کہ جس کے بعد کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

صرف سرورق پیکن پریس نیل روڈ لاہور میں طبع ہوا